خواتین کو درپیش عصری معاشرتی، معاشی وسیاسی مسائل
اور ان کا حل سیرت طیبہ کی روشنی میں

مقرّر: علامہ زاہد الراشدی

سیرت النبی ﷺ چیئر

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

خواتین کودرپیش عصری سماجی، معاشی وسیاسی مسائل اوران کا حل سیرت طیبہ کی روشنی میں

مقرر: علامہ زاہدالراشدی

سیرت چیئر

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

موضوع: خواتین کو درپیش عصری سماجی، معاشی وسیاسی مسائل اوران کا حل سیرت طیبہ کی روشنی میں

مقرر: علامہ زاہد الراشدی

تدوین وترتیب: ڈاکٹر محمد سجاد

نگران: پروفیسر ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمان

منتظم: پروفیسر محمد رفیق طاہر

کمپوزنگ وصدابندی: ابتسام الرحمان

تخریج آیات واحادیث: ابتسام الرحمان

فارمیٹنگ وڈیزائننگ: مشتاق حسین

ناشر: سنٹر آف ایکسی لینس علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

طابع: سیرت چیئر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اکیڈمک کمپلیکس، H/8 اسلام آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیرت چیئر کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد یہ ہے کہ معاشرہ میں افہام و تفہیم و مکالمہ کی فضا کو پروان چڑھا کے وہ سلگتے مسائل جو سوسائٹی کے لیے شکست وریخت کا سبب بنے ہوئے ہیں، من پسند توجیہات کے ذریعے احکام اسلامی سے انحراف اور روح اسلام سے روگردانی کا عمل جاری ہے۔ان مسائل پر سیمینارز اور مکالمے کا سلسلہ شروع کیا جائے تاکہ احکام کی حقیقت واضح ہو کر سامنے آسکے۔ چنانچہ اس سلسلے کا پہلا پروگرام خواتین کو درپیش عصری مسائل سے متعلق تھا۔ جس کے لیے ہم نے ملک عزیز کے انتہائی جہاندیدہ، قدیم وجدید علوم اور معروضی حالات پر گہری نظر رکھنے والے متبحر عالم جناب علامہ زاہد الراشدی صاحب (صدر مدرس و ناظم تعلیمات جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ) سے درخواست کی کہ وہ اس موضوع پر اپنے افکار عالیہ سے مستفیض فرمائیں۔ سوالات کے لیے دیگر اہل علم کے علاوہ معروف کالم نگار اور گہری دینی فکر سے مزین جناب خورشید احمد ندیم صاحب، علوم اسلامیہ کے استاذ گرامی جناب ڈاکٹر ظفر اللہ بیگ صاحب و دیگر اہل علم موجود تھے۔ یہ مکالمے کا آغاز ہے۔ پیش نظر موضوع سے متعلق نہ ہی یہ حتمی رائے ہے اور نہ ہی اسے کوئی فتوی کی حیثیت حاصل ہے۔ سوچ وبچار کی راہیں کھولنے کا آغاز ہے۔ امید ہے کہ ان فکری مباحث کے مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمان
صدر نشین سیرت چیئر

تعارف مولانا زاہد الراشدی

نام

محمد عبدالمتین خان زاہد (المعروف ابو عمار زاہد الراشدی)

ولدیت

مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ

پیدائش

۲۸ اکتوبر ۱۹۴۸ء بمقام گکھڑ، ضلع گوجرانوالہ، پاکستان

قوم

سواتی پٹھان

آبائی گاؤں

اچھڑیاں، ضلع مانسہرہ (ہزارہ)

تعلیم

حفظ قرآن کریم (مدرسہ تجوید القرآن گکھڑ)

فاضل درس نظامی (مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)

فاضل وفاق المدارس العربیہ پاکستان (مساوی ایم اے عربی و اسلامیات)

تدریسی خدمات

مدرس درس نظامی (مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ ۱۹۷۰ء تا ۱۹۹۰ء)

صدر مدرس و ناظم تعلیمات (جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ ۲۰۰۰ء تا حال)

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں مختلف مضامین کی مستقل تدریس

مختلف جامعات میں بطور مہمان لیکچرار، وقتاً فوقتاً خطاب

سیاسی خدمات

سیکرٹری اطلاعات جمعیت علماء اسلام پاکستان (مولانا مفتی محمودؒ کے نائب کی حیثیت سے ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء)

ڈپٹی سیکرٹری جنرل جمعیت علماء اسلام پاکستان (۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۰ء)

سیکرٹری جنرل پاکستان قومی اتحاد پنجاب (۱۹۷۷ء تا ۱۹۷۹ء)

نائب صدر اسلامی جمہوری اتحاد، پنجاب (۱۹۸۷ء تا ۱۹۹۰ء)

تحریری خدمات

۱۹۶۵ء سے اب تک مختلف اخبارات و جرائد میں علمی، سیاسی اور قومی مسائل پر کم و بیش دو ہزار کے لگ بھگ مضامین و مقالات اور متعدد عنوانات پر کتابی مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں۔

قومی و دینی تحریکات میں حصہ

۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت

۱۹۷۶ء کی تحریک واگزاری مسجد نور، گوجرانوالہ

۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ

۱۹۸۴ء کی تحریک ختم نبوت اور

۱۹۸۷ء کی تحریک "شریعت بل" میں سرگرم کردار ادا کیا اور ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ، کیمپ جیل لاہور اور ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا میں مختلف اوقات میں کئی ماہ گزارے۔

تنظیمی خدمات

سیکرٹری جنرل پاکستان شریعت کونسل (۱۹۹۸ء تا حال)

بانی و سرپرست ورلڈ اسلامک فورم لندن (۱۹۹۵ء تا حال)

سیکرٹری اطلاعات کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت پاکستان

سیکرٹری اطلاعات متحدہ علماء کونسل (۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۰ء)

سینئر نائب صدر ملی مجلس شرعی پاکستان (تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کا مشترکہ فورم)

کنوینر رابطہ کمیٹی تحریک انسداد سود پاکستان

صحافتی خدمات (۱۹۶۵ء تا حال)

رپورٹر روزنامہ وفاق لاہور

مدیر ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور

مضمون نگار ہفت روزہ خدام الدین لاہور

مدیر اعلیٰ ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ

کالم نگار روزنامہ اوصاف اسلام آباد (۱۹۹۵ء تا ۲۰۰۰ء اور ۲۰۱۴ء تا حال)

کالم نگار روزنامہ اسلام لاہور (۲۰۰۱ء تا حال)

دیگر ذمہ داریاں

خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ (۱۹۷۰ء تا حال)

رکن صوبائی اتحاد بین المسلمین کمیٹی حکومت پنجاب

بانی وڈائریکٹر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ (۱۹۸۹ء تاحال)

رکن قومی علماء مشائخ کونسل حکومت پاکستان

رکن پنجاب قرآن بورڈ حکومت پنجاب

رکن ضلعی امن کمیٹی گوجرانوالہ

بیرونی تعلیمی و تبلیغی دورے

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بنگلہ دیش، کینیا، ایران، مصر، ترکی، ازبکستان، بھارت، امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، افغانستان، جنوبی افریقہ، ہانگ کانگ۔

خواتین کو درپیش عصری سماجی، معاشی، وسیاسی مسائل اور ان کا حل
سیرت طیبہ کی روشنی میں

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام علي سيد الرسل وخاتم النبيين وعلى آله واصحابه اجمعين

امابعد!

صدر ذی وقار جناب محترم ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب، ہمارے مخدوم و محترم پروفیسر فتح محمد ملک صاحب، اور عالی مرتبت ڈاکٹر ساجد الرحمٰن صاحب اور دیگر شرکائے محفل ارباب علم ودانش!

میں شکر گذار ہوں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا، سیرت چیئر کا، اور بطور خاص محترم پروفیسر ڈاکٹر ساجد الرحمٰن صاحب کا کہ انہوں نے اہل علم ودانش کے ساتھ ایک علمی موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع فراہم کیا، ملاقات بھی ہورہی ہے، زیارت بھی کر رہا ہوں اور کچھ باتیں کہوں گا بھی، سنوں گا بھی ان شاءاللہ ۔آج کی اس نشست میں ہمارے اصحاب دانش، ہمارے بھائی بھی شریک ہیں، بہنیں بھی شریک ہیں، بیٹے بھی شریک ہیں بیٹیاں بھی شریک ہیں سب کو خوش آمدید اور خیر مقدم کرتے ہوے میں موضوع کی طرف آتا ہوں۔ موضوع جو دیا گیا وہ ہے : "خواتین کو درپیش معاشرتی ،معاشی وسیاسی مسائل اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ان کا حل"۔ اگرچہ اس کا دوسرا پہلو بھی ہے اس کا ذکر کر دیتا ہوں بات کسی اور موقعے پر کروں گا ان

شاءاللہ۔ خواتین کو درپیش معاشرتی مسائل یہ ایک مستقل موضوع ہے اور خواتین سے درپیش مشکلات و مسائل مستقل موضوع ہے وہ ان شاء اللہ پھر کبھی موقع ملا تو عرض کروں گا۔ لیکن آج خواتین کو درپیش مشکلات اور مسائل اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کی روشنی میں ان کا حل، یہ آج کی گفتگو کا موضوع ہے۔ جب ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے دائرے میں رہ کر بات کرنی ہے تو میں اس کی ترتیب یوں قائم کروں گا، پہلے تو یہ بات کہ مرد اور عورت انسانی سوسائٹی اور سماج کا بنیادی یونٹ اور دو پہیے ہیں اور یہ ایک مستقل موضوع گفتگو ہوتا ہے کہ انسانی سماج کی بنیاد جوڑا ہے، جوڑا آیا تھا، اللہ رب العزت نے "اهبطا[1]" (تم دونوں اتر جاؤ) کہہ کے جوڑا بھیجا تھا، اور شادی پہلے ہی کر دی تھی۔ "اسکن انت وزوجك الجنة[2]" شادی وہیں ہو گئی تھی شادی شدہ جوڑا بھیجا تھا، یہ سوسائٹی کا بنیادی یونٹ ہے، یہ مستقل ایک موقف ہے کہ فرد نہیں ہے خاندان ہے، انسانی سماج کا بنیادی یونٹ فرد نہیں ہے خاندان ہے۔ جوڑا آیا تھا شادی شدہ جوڑا آیا تھا اس نے یہاں "بث منهما رجالا كثيرا و نساء[3]" (ان دونوں سے اللہ تعالی نے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کر کے پھیلا دیے) تو یہ انسانی سماج کے دو پہیے ہیں اور بنیادی یونٹ ہے فیملی، خاندان، میاں بیوی، شروع سے چلے آرہے ہیں۔ اور قیامت تک ان شاء اللہ رہیں گے، اسی طرح رہیں گے۔ مسائل مشکلات بھی پیش آتے رہے ہیں، حل بھی ہوتے رہے ہیں، الجھتے بھی رہے ہیں۔ میں

---

1. طہ:123
2-البقرۃ:35
3-النساء:1

اس تناظر میں پہلی بات یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دور میں اس حوالے سے کیا مسائل در پیش تھے؟ انہوں نے کیسے حل فرمائے؟ پھر ہم ان سے رہنمائی لیں گے کہ آج کیا مسائل در پیش ہیں؟ اور ان کے لیے ہمارے پاس سیرت طیبہ علی صاحبہا التحیۃ والسلام میں روشنی کے کون کون سے دریچے کھلے ہیں؟ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے حوالے سے بات اس لیے کروں گا کہ ساری معلومات کا اور سارے دین کا اور ساری باتوں کا سرچشمہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ اقبال نے بھی یہ ہی کہا ہے:

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

(اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ جوڑ کے رکھو کہ وہی دراصل دین ہیں۔

اگر ایسا نہ کیا تو پھر تیرے سارے اعمال ابولہب والے (یعنی اسلام کے خلاف ہیں)۔)

اور حضرت شاہ ولی اللہ بھی یہ ہی کہتے ہیں کہ تمام علوم دینیہ اور یقینیہ کا سرچشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے حتیٰ کہ قرآن پاک تک رسائی کا واحد ذریعہ بھی حضور کی ذات ہے، اس لیے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بات منسوب ہو گی وہ اللہ تعالیٰ کی بات بھی ہو گی، قرآن کی بات بھی ہو گی، شریعت کی بات بھی ہو گی تو اس دائرے میں رہتے ہوئے میں یہ چاہوں گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندانی نظام میں اور عورت و مرد کے تعلقات اور معاملات میں معاشرتی طور پر مسائل جو در پیش

تھے اس وقت ان کا کیا حل فرمایا تھا؟ اور اس میں ہمارے لیے آج کیا سبق ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندانی نظام میں جو اصلاحات کی تھیں ان میں سے پانچ سات کا ذکر کرنا چاہوں گا پہلے مرحلے میں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن پاک نے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو زندگی کا حق دیا، اس وقت کا عمومی تناظر یہ تھا" وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌۚ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ[4]"

ترجمہ: اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کی پیدائش) کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے، اس خوشخبری کو برا سمجھ کر لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، (اور سوچتا ہے کہ) ذلت برداشت کر کے اسے اپنے پاس رہنے دے یا اسے زمین میں گاڑ دے۔

بچی پیدا ہوتی تھی تو باپ کے رحم و کرم پر، وہ چاہے تو زندہ رہنے دے چاہے تو" یدسہ فی التراب" مٹی میں دبا دے۔ زندگی کا حق اس کا نہیں تھا، باپ کی صوابدید تھی، قرآن پاک نے اس کو اس جملے میں بیان کیا ہے "ایمسکہ علی ھون ام یدسہ فی التراب" باپ کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ ذلت کے ساتھ اس کو روکے یا عزت کے ساتھ اس کو دفن کر دے۔ تو پہلا حق جو عورت کو دیا اللہ پاک نے وہ زندگی کا ہے، عورت کا بھی زندگی کا حق ہے۔ اور یہ ایک لمبا مسئلہ ہے لیکن اس پر ابھی ایک تازہ فیصلہ آیا ہے امریکن

---

4. النحل:58

سپریم کورٹ کا، میں اس کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہوں گا کہ اسقاط حمل پر جو دنیا میں بحث چل رہی ہے اور پاپائے روم کا موقف بھی یہی ہے اور ہمارا موقف بھی یہ ہی ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچہ جب حرکت کرنے لگ جائے، زندگی آجائے تو اس کے بعد اس کا اسقاط قتل ہے۔ اور مجھے خوشی ہوئی ہے کہ پچھلے ہفتے امریکن سپریم کورٹ نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔ اس کے بعد اسقاط حمل کا حق غیر مشروط نہیں ہے۔ زندگی کے بعد یہ جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی ہلکا پھلکا لطیفہ بھی ہو جائے کوئی حرج تو نہیں ہے؟ یہ مسئلہ ویسے تو دنیا میں درپیش ہے لیکن انڈیا میں زیادہ ہے کہ جب الٹرا ساؤنڈ سے پتہ چلتا ہے کہ بچی ہے تو اسقاط حمل فرض ہو جاتا ہے۔ اس پر سابق وزیر اعظم انڈیا منموہن سنگھ جی کا ایک خطاب بھی ہے جس کا میں نے بھی کہیں حوالہ دیا تھا، انہوں نے ایک کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے مسلمان علماء سے کہا تھا کہ ہمارے ہندو بھائیوں کو سمجھاؤ کہ بچی کا بھی دنیا میں آنے کا حق ہوتا ہے اور بچی کا بھی زندگی، حق ہے۔ اس پر لطیفہ یہ ہے کہ ایک کارٹون میں نے دیکھا، کارٹون میں ایک خاتون کلینک میں اسقاط حمل کے لیے گئی ہے اور وہ سٹریچر پر ہے، بچی اندر سے آواز دے رہی ہے ڈاکٹر انکل مجھے دنیا میں آنے دو، ماما سے زیادہ فیس دوں گی۔ کارٹون کا منظر یہ ہے کہ وہ آواز دے رہی ہے ڈاکٹر انکل مہربانی کر کے مجھے دنیا میں آنے دو، ماما سے زیادہ فیس دوں گی۔ یہ وہ پہلا حق ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا اور بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار واقعات ہیں لیکن ایک واقعہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کا خاتمہ کیا اور عورت کو زندگی کا حق دیا تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں معاشرتی تبدیلی کیا آئی؟ ایک حساس شاعر نے اپنی نظم میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ کوئی

صاحب ایک سردار کے پاس لڑکی کا رشتہ مانگنے کے لیے گئے تو اس نے جواب دیا کہ چھوڑو بھائی میرے پاس مت آؤ "غدا الناس مذ قام النبی الجواریا" جب سے یہ نبی آیا ہے ہر طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہو گئی ہیں۔ یہ اس دور کا معاشرتی تناظر ہے "غدا الناس مذ قام النبی الجواریا" جب سے یہ نبی آیا ہے ہر طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں تو میرے پاس نہ آؤ کہیں اور تلاش کر لو۔ یہ اس وقت تبدیلی آئی ہے۔ دوسری بات جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو زندگی کا حق بھی دیا اور عورت کے قتل کو قتل قرار دیا، یہ ہی نہیں بلکہ ماں کے پیٹ میں قتل کو بھی قتل قرار دیا اور اس کی دیت دلوائی، یہ تبدیلی آئی۔ عورت کو رائے کا حق دیا۔ اور یہ بات بڑے خوبصورت انداز میں امام بخاری نے ایک طویل روایت میں نقل کی ہے جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم تو عورت کو رائے کا کوئی حق نہیں دیا کرتے تھے بالخصوص قریش والے کہ عورت کسی بات سے اختلاف کرے، کسی بات پر ٹوکے۔ لیکن "فلما جاء الاسلام" جب اسلام آیا۔ حضرت عمر کے الفاظ ہیں "فلما جاء الاسلام[5]" جب اسلام آیا تو ہمیں پتہ چلا کہ نہیں اس کا بھی کوئی رائے کا حق ہوتا ہے یہ کسی بات پر اختلاف کر سکتی ہے، کسی بات پہ روک سکتی ہے، ٹوک سکتی ہے۔ وہ واقعہ بہت لمبا ہے لیکن خلاصہ عرض کر دیتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے بخاری شریف کی روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم قریشیوں میں مکے کا ماحول یہ تھا کہ عورت خاوند کی کسی بات پہ ٹوک نہیں سکتی تھی، ماحول ہی نہیں تھا۔ انصار کی عورتیں اس معاملے میں ذرا آزاد تھیں کہ بات کی، اختلاف کیا، ٹوک دیا، انکار کر دیا۔ تو فرماتے ہیں ایک دن میں نے

6۔ایضا

اپنی اہلیہ سے کوئی بات کہی، اس نے مجھے ٹوکا، نہیں نہیں ایسے نہیں ایسے ہے۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے کہا تو کون ہے ٹوکنے والی؟ تیرا کیا حق ہے؟ بس میں نے کہہ دیا سو کہہ دیا۔ اس نے کہا مجھے زیادہ غصے نہ ہوں، بیٹی کو جا کے پوچھیں (ام المؤمنین حفصہ رضی اللہ عنہا)۔ بیٹی سے جا کے پوچھیں، وہاں کا ماحول دیکھیں وہ بھی اختلاف کرتی ہیں۔ حضرت عمر کہتے ہیں میں نے فورا کپڑے سمیٹے اور گیا حفصہ کے گھر۔ بیٹی! کسی بات کا جواب بھی دیتی ہو؟ جی۔ کسی بات پہ ٹوک بھی دیتی ہو؟ جی۔ بیٹی کسی بات پہ انکار بھی کر دیتی ہو؟ جی ۔ میاں بیوی ہیں۔ او خدا کی بندی یہ کیا کرتی ہو۔ حضرت عمر کہتے ہیں میں نے پورا لیکچر دیا ، لیکچر نہیں دیا ڈانٹا۔ بیٹا نہیں نہیں ۔۔۔ نہیں نہیں۔ کسی بات سے اختلاف نہیں کرنا ، کسی بات پہ روکنا نہیں ہے، کسی پہ ٹوکنا نہیں ہے۔ کسی کا جواب نہیں دینا، کسی پہ انکار نہیں کرنا۔ زیادہ تر جھگڑے ہوتے ہیں جن معاملات میں مثلا کوئی چیز ضرورت ہو تو مجھ سے مانگ لیا کرو، بیوی کا خاوند سے زیادہ جھگڑا اسی پر ہوگا نا۔ کوئی چیز ضرورت ہو مجھ سے کہہ دیا کرو میں دیدیا کروں گا۔ خیر وہ بیٹی تھی، سنتی رہی میں ڈانٹتا رہا۔ کہتے ہیں اس کے بعد میرا جی چاہا کہ میں اور ازواج مطہرات کے پاس بھی جاؤں اور انہیں کہوں کہ یہ کیا کر رہی ہو تم! ہمارا تو مزاج یہ نہیں ہے۔ تو میں سب سے پہلے ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گیا۔ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ تعالی عنہا، بڑی باوقار خاتون تھیں، ساری ہی باوقار تھیں لیکن یہ بڑی صاحب الرائے خاتون تھیں، یہ ان کی کزن لگتی تھیں۔ کزن بڑا جامع رشتہ ہے، تو کہتے ہیں کہ میں ام سلمہ کے پاس گیا۔ ام سلمہ! کیا حضور کے گھروں میں ایسا ہوتا ہے؟ ہوتا ہے۔ جواب دیتی ہو؟ دیتی ہیں۔ ناراض بھی ہوتے ہیں اور سارے معاملات ہوتے ہیں۔ میں نے ام سلمہ کے ساتھ بھی اسی لہجے میں

بات کرنا چاہی جس لہجے میں بیٹی سے بات کی تھی۔ام سلمہ نے مجھے ڈانٹ دیا۔"یاابن الخطاب! دخلت فی کل شیئ حتی تبتغی ان تدخل بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وازواجہ[6]"او خطاب کے بیٹے! ہر بات میں دخل دیتے ہو، حضور کی بیویوں اور حضور کے معاملات میں بھی دخل دینے آگئے ہو۔وہ برابر کی تھیں، کزن تھیں، ڈانٹ دیا۔حضرت عمر فرماتے ہیں: "اکسرت ظھری" ام سلمہ نے تو میری کمر ہی توڑ دی۔میں نے پتہ نئ کس کس کو کیا کیا ڈانٹنا تھا۔وہاں سے میں واپس آیا۔جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں میں نے جاکے رپورٹ دی۔یا رسول اللہ! یہ میں نے سنا تھا اور حفصہ کو تو میں نے ڈانٹا ہے، وہ تو بیٹی تھی سنتی رہی، ام سلمہ کو میں نے ڈانٹا تو اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔بخاری کی روایت میں ایک جملہ ہے، حضور مسکرائے اور فرمایا: "ھی ام سلمۃ" تمہیں پتہ تو ہے ام سلمہ ہے، وہاں کیا کرنے گئے تھے۔حضور نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "ھی ام سلمۃ"۔ام سلمہ ہے وہ۔یہ حضرت عمر اس کو تعبیر کررہے ہیں کہ عورت کو رائے کا حق اسلام نے دیا۔"فلما جاء الاسلام" اسلام نے عورت کو زندگی کا حق دیا، زندگی کے بعد رائے کا حق دیا اور رائے کے ساتھ، علم۔صرف رائے نہیں۔جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پاک، قرآن پاک کی تشریح، احادیث اور احکام روایت کرنے والے مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔جہاں ہزاروں مرد ہیں سینکڑوں عورتیں ہیں، حضور سے روایت کررہی ہیں۔اور محدثین نے آج تک اس بات پہ بحث نہیں کی کہ مرد کی روایت میں اور عورت کی روایت میں کوئی فرق ہے۔اس کا گریڈ انیس ہے اور اس کا اٹھارہ ایسا نہیں ہے۔جو درجہ مرد کی رویات کا

7.ایضا

ہے وہی عورت کی روایت کا ہے۔جو درجہ حضرت عمر کی روایت کا ہے وہی درجہ ام المؤمنین حضرت حفصہ کی روایت کا ہے،جو حضرت صدیق اکبر کی روایت کا ہے وہی حضرت عائشہ کی روایت کا ہے، جو ابودرداء کی روایت کا ہے وہی ام درداء کی روایت کا ہے۔وہ حدیث کی تفسیر ہو،روایت ہو،، حکم شرعی ہو۔مجھے بھی حدیث پڑھاتے ہوئے پچاس سال ہوگئے،مجھے نہیں ملا کہ کسی محدث نے یہ فرق کیا ہو کہ چونکہ یہ عورت کی روایت ہے اس لیے اس کا گریڈ کم ہے،ہاں ایک فرق ہے،بہت سے واقعات میں ملے گا آپ کو، محدثین کے ہاں بھی،فقہاء کے ہاں بھی کہ جس روایت کا تعلق گھر کے ماحول سے ہے وہاں عورت کی روایت کو ترجیح ہے۔جس روایت کا تعلق مجلسی زندگی سے ہے اس میں ترجیح مرد کی روایت کو حاصل ہے اور جس روایت کا تعلق چاردیواری کے اندر سے ہے،اس میں محدثین بھی فقہاء بھی عورت کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔بات لمبی ہو جائے گی اس لیے میں اس کو اسی دائرے میں رکھتا ہوں کہ رائے کا حق بھی، علم کا حق بھی۔ام المؤمنین ، تمام ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن امت کی معلمات تھیں ،امت نے سب سے علم سیکھا ہے، کس دائرے میں سیکھا ہے ؟اس پر بھی ایک لطیفہ عرض کردیتا ہوں۔کچھ عرصہ پہلے واشنگٹن ٹائمز نے ،میں ان دنوں اتفاق سے واشنگٹن میں تھا،ورجینیا میں۔تو میں تو انگریزی نہیں جانتا ان پڑھ آدمی ہوں،ہمارے میزبان نے کہا کہ آج واشنگٹن ٹائمز نے انڈیا کے ایک مدرسے، حیدرآباد دکن کے دارالعلوم پر بڑا اچھا فیچر لکھا ہے کہ وہاں کے دارالعلوم کے مفتی صاحب نے عورتوں کو مفتی بنانے کا ایک چینل قائم کیا ہے اور مفتیات بنا کر عورتوں کے لیے ایک چینل دیدیا ہے کہ خواتین اپنے مسائل اس چینل پر خواتین سے پوچھیں۔یہ پرانی روایت ہے

ہماری۔ خواتین اپنے مسائل خواتین سے پوچھیں، وہ روزانہ دو گھنٹے بیٹھتی ہیں، دارالعلوم حیدرآباد کے تحت۔ خواتین ہیں بطور مفتیہ بیٹھتی ہیں، اس پر اس نے کہا بہت اچھا فیچر لکھا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے سناؤ کیا لکھا ہوا ہے؟ میں نہیں پڑھ سکتا، انہوں نے مجھے خلاصہ سنایا۔ میں نے کہا آخر میں کیا لکھا ہے؟ آخری جملہ کیا ہے؟ میں انگریزی نہیں جانتا لیکن صحافی ہوں اور صحافت کے سارے داؤ پیچ سمجھتا ہوں، تو میں نے کہا آخری جملہ کیا ہے؟ یعنی واشنگٹن ٹائم ایک دینی مدرسے پر اچھا فیچر لکھے؟

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو اس میں

میں نے کہا کچھ بات ہو گی اس میں۔ تو میں نے کہا آخری جملہ سناؤ۔ اس نے کہا کہ اس میں لکھا ہے: "مسلمان اپنی روایات چھوڑ کر عورت کے بارے میں ہماری روایت پہ آ گئے ہیں"۔ میں نے کہا اس جملے کے لیے سارا فیچر لکھا ہے اس نے۔ سارا فیچر، اس نے اتنی محنت کی ہے یہ جملہ کہنے کے لیے۔ کہ مسلمان عورت کے بارے میں اپنی روایات سے ہٹ کر ہماری روایت پر آ گئے ہیں۔ واشنگٹن ٹائم تک میری رسائی کہاں تھی، میں نے اپنے یہاں پاکستانی اخبارات میں سے کسی میں اس کے جواب میں کالم لکھا، میں نے کہا: بھائی نہیں۔ ہم روایات سے ہٹے نہیں ہیں روایات کی طرف واپس آ گئے ہیں۔ عورت کی تعلیم، حدیث، قرآن، فقہ ساری تعلیم، میں اس کا دائرہ بتاؤں گا کہ عورت کی تعلیم کا دائرہ کیا ہے؟ لیکن یہ ہم روایات سے ہٹے نہیں ہیں، ہم تو اپنی روایات پر واپس جا رہے ہیں۔ ہماری دور قدیم کی روایات یہ ہیں کہ عورت عالمہ بھی تھی، مفتیہ بھی تھی

، محدثہ بھی تھی، مجتہدہ بھی تھی، قاضیہ بھی تھی۔ ہم اپنی روایت کی طرف واپس جارہے ہیں۔اس جملے کا جواب میں نے یہ دیا کہ ہم اپنی روایات سے منحرف نہیں ہوئے،اپنی روایات کی طرف واپس جارہے ہیں۔اب علمی حوالے سے اس پر اپنی معلومات عرض کرنا چاہوں تو لمبا قصہ ہے لیکن دو باتیں شیئر کروں گا۔ پہلی بات: اس وقت صحابہ کے دور میں تقریبا نصف صدی تک خواتین میں سب سے بڑی معلمہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ان کی درسگاہ کی پوری کیفیت سید سلیمان ندوی نے سیرت عائشہ میں بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔ان کا علم کا دائرہ کیا تھا؟ان کے شاگردوں میں بڑے شاگرد ہیں عروہ بن زبیر۔بھانجے بھی ہیں شاگرد بھی ہیں۔اور ان کے علمی جانشینوں میں بھی ہیں۔ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علوم اور معارف کے تین جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ایک بھتیجا ہے، قاسم ابن محمد،ایک بھانجا ہے عروہ ابن زبیر اور ایک خاتون ہیں عمرۃ بنت عبدالرحمان۔اور یہ عمرۃ ہی اصل جانشین ہیں ان کی۔جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالی نے سرکاری طور پر حدیثیں لکھوانے کا آرڈر جاری کیا، گورنروں کو لکھا کہ تمہارے ہاں جو بھی محدثین موجود ہیں ان کی روایات کو قلمبند کرکے محفوظ کرو "انی خفت دروس العلم وذھاب العلماء" مجھے ڈر لگ رہاہے،علماء جارہے ہیں، علم بھی ساتھ ہی جارہاہے۔تو اپنے علاقے کے محدثین کے علوم کو قلمبند کرو۔مدینہ منورہ کے گورنر کو لکھا،ابو بکر ابن حزم کو۔دیکھو بھئی۔یہ تمہاری پھوپھی ہیں۔ان کی پھوپھی تھیں عمرۃ۔ عمرۃ بنت عبدالرحمن کی روایات پہ بطور خاص توجہ دینا،اس کی کوئی بات ضائع نہ ہونے پائے۔کیوں؟ یہ حضرت عائشہ کے علوم کی وارث ہیں۔ حضرت عائشہ کے علوم کا دائرہ کیا تھا؟ان کے سب سے بڑے شاگرد عروہ

سے پوچھیں ۔عروہ ابن زبیر رضی اللہ تعالی عنہ کہتے ہیں ،ان کا مشہور مقولہ ہے۔"مارئیت اعلم"میں نے صحابہ کرام میں ،سات یا آٹھ علم گنے ،ان علوم میں حضرت عائشہ سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔قرآن کی تفسیر میں ،حدیث کی روایت میں ،استنباط میں ،تاریخ میں ،انساب میں ،طب میں اور شعر وشاعری میں۔اس میں ہسٹری یعنی تاریخ بھی شامل ہے اور انساب عرب بھی۔لوگ ان سے آکے پوچھا کرتے تھے کہ فلاں کا نسب کیسا ہے؟اور طب بھی اس میں شامل ہے ۔ان علوم میں وہ کہتے ہیں : "مارئیت احدا اعلم" میں نے حضرت عائشہ سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔یہ عروہ کہہ رہے ہیں ان کے سب سے بڑے شاگرد۔بھانجے بھی ہیں۔تو خیر میں نے عرض کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو رائے کا حق بھی دیا،علم کا حق بھی دیا۔اور علم میں بھی کوئی تخصیص نہیں ہے علم علم ہے۔اس پہ بڑے واقعات بھی ہیں،بڑی تفصیلات بھی ہیں لیکن میں ایک اور بات شیئر کرنا چاہوں گا۔ہمارے ایک دوست ہیں آکسفورڈ میں ڈاکٹر محمد اکرم ندوی۔لکھنؤ کے ہیں ۔ہمارے دوستوں میں سے ہیں ۔آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک سٹڈیز کے اسکالر ہیں۔انہوں نے ایک زمانے میں محدثات پہ کام شروع کیا۔امت میں محدثات کون سی گذری ہیں جنہوں نے حدیث پڑھی ہے ،حدیث پڑھائی ہے۔حدیث لی بھی ہے اور آگے منتقل بھی کی ہے،راویہ ہیں حدیث کی ،محدثہ ہیں۔تو دس سال لگے انہیں تقریبا،میں بھی مشاورت میں بعض مراحل میں شریک ہوا۔وہ کتاب بیروت سے چھپی ہے "الوفاء فی اخبار النساء"۔غالبا چالیس جلدوں میں ہے۔اور آٹھ ہزار محدثات کے حالات اس میں شامل ہیں۔ام المؤمنین حضرت عائشہ سے لے کر آج کی زندہ محدثات تک۔جنہوں نے حدیث پڑھی ہے،جنہوں نے

حدیث پڑھائی ہے۔ تو میں نے دوسری بات یہ عرض کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو رائے کا حق دیا اور علم کا حق دیا اور علم کا صرف حق ہی نہیں دیا بلکہ علمی مقام دیا۔ عورتوں کا بھی علم میں وہی مقام ہے جو مرد حضرات کا ہے۔ میں واقعات کی تفصیلات میں جاؤں گا تو سارا وقت اسی میں گذر جائے گا۔ میں اس کو یہیں سمیٹتا ہوں۔

تیسری بات۔ وراثت کا حق دیا۔ وراثت کا حق اس زمانے میں کہیں تھا کہیں نہیں تھا۔ یہ نہیں کہ بالکل نہیں تھا۔ قبائل کا سسٹم تھا۔ قبائل کے اپنے اپنے رواج تھے۔ کہیں تھا کہیں نہیں تھا۔ کہیں بالکل نہیں ملتی تھی، کہیں تھوڑی ملتی تھی، کہیں کسی کی صوابدید پر بھی ہوتا تھا۔ مختلف فارمولے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا کام تو یہ کیا کہ جو ساری متفرق روایات تھیں ان کو ایک قانون پہ جمع کر دیا۔ معاشرتی طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جزیرۃ العرب پر بالخصوص اور نسل انسانی پر بالعموم دو بڑے احسان ہیں۔ ایک احسان یہ کہ حضور نے قبائل کی روایات میں سے جو اچھی روایات تھیں اللہ پاک نے جن کی اجازت دی وہ ایک ضابطے میں لے آئے۔ جزیرۃ العرب میں بیسیوں قبائلی قوانین تھے۔ انہیں مرکزیت عطا فرمائی۔ اور جزیرۃ العرب پر تو حضور کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ پہلی بار جزیرۃ العرب کو حکومت و ریاست کے تصور سے آشنا کیا۔ جزیرۃ العرب بحیثیت جزیرۃ العرب ریاست سے بھی نا آشنا تھا اور حکومت سے بھی نا آشنا تھا۔ یہ تو مورخ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جزیرۃ العرب میں حضور جب تشریف لائے ہیں، مدینہ منورہ میں آئے ہیں تو بحیرا ایک سمندری پٹی پر ریاست مدینہ

بنی تھی اور جب نو دس سال کے بعد دنیا سے پردہ پوش ہوئے ہیں تو جزیرۃ العرب پوری ریاست کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یمن سمیت، بحرین سمیت۔ اور اس ریاست کی رٹ قائم کرنے کے لیے، رٹ بحال رکھنے کے لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کتنی جنگیں لڑی تھیں۔ ریاست کا دائرہ جزیرۃ العرب تھا۔ یہ پہلا موقع تھا تاریخ میں کہ جزیرۃ العرب ریاست سے متعارف ہوا، جزیرۃ العرب حکومت سے متعارف ہوا۔ اور قوانین کی یکسانیت سے کہ بیسیوں طرز کے قوانین کو حضور نے ایک دائرے میں لا کر ایک منضبط قانون کی شکل دی ان میں ایک وراثت کا قانون بھی تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو وراثت دلوائی اور یہ واحد مسئلہ ہے، میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآن پاک نے نماز کی تفصیلات نہیں بیان کیں، روزے کی ساری تفصیلات نہیں بیان کیں، حج کی تفصیلات نہیں بیان کیں، ہاں یہ کہا کہ ان سے سیکھو۔ ارشاد فرمایا "صلوا کما رأیتمونی اصلی[7]" جیسے مجھے نماز پڑھتے ہوے دیکھو ویسے تم بھی نماز پڑھو۔ حج کے بارے میں فرمایا "" خذوا عنی مناسککم[8]" مجھ سے پوچھو حج کیسے کرنا ہے؟ لیکن وراثت کے حصے قرآن پاک نے خود طے کر کے بیان کیے ہیں۔ اس کا چھٹا حصہ ہے، اس کا دوسرا حصہ ہے، اس کا تیسرا حصہ ہے، اس کا چوتھا حصہ ہے، اس کا آٹھواں حصہ ہے، اس کا ہے اس کا نہیں ہے۔ یہ واحد مسئلہ ہے جس میں قرآن پاک نے دوٹوک حکم دیا اور یہ کہا کہ تم اس میں تبدیلی نہیں کر سکتے۔ تمہیں کوئی اختیار نہیں ہے تبدیلی کرنے

8صحيح البخاری،کتاب الأذان،باب المكث بين السجدتين
صحيح مسلم،کتاب الحج،باب استحباب رمي جمرة العقبة يوم النحر راكبا ،بيان
9قوله صلى الله عليه وسلم :لتأخذوا عنى مناسككم

کا۔ بلکہ اس کے ساتھ اگر ترمذی کی ایک روایت شامل کرلیں تو بات ذرا اور واضح ہو جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس مرد یا عورت نے زندگی کے ساٹھ سال اللہ کی اطاعت میں گذارے لیکن پھر مرتے وقت اس نے (وراثت کے حصوں میں اپنی طرف سے گڑبڑ کرکے) وصیت (وغیرہ) کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو وہ جہنم میں جائے گا[9]"۔ یہاں میں کہا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی فرما رہے ہیں کہ میں نے حصہ مقرر کیا ہے تم کون ہو نہ دینے والے۔ جو کسی کو اس کے حصے سے محروم کرنے کی کوشش کرے گا وہ جہنم میں جائے گا۔

میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں، رائے شخصی معاملات میں، اجتماعی معاملات میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ ہے کہ رائے لیتے بھی تھے، مانتے بھی تھے، عورتیں رائے دیتی بھی تھیں۔ ایک واقعہ عرض کرنا چاہوں گا، بیسیوں واقعات ہیں۔ عورتیں رائے دیتی تھیں، پبلک مسائل میں، اجتماعی مسائل میں، رائے سنی جاتی تھی، رائے پوچھی جاتی تھی کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ بڑا مشہور واقعہ ہے۔ حدیبیہ میں جب معاہدہ ہو گیا، معاہدہ مسلمانوں کے جذبات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ عمرہ کرنے آئے ہیں، عمرہ کیے بغیر واپس جا رہے ہیں، دل ڈانواڈول ہو رہے تھے۔ اور مشرکین کی یہ شرط کہ ہم میں سے کوئی آدمی آیا تو آپ واپس کریں گے، آپ میں سے کوئی آیا تو ہم واپس نہیں کریں گے۔ اس پہ تو حضرت عمر بھی مضطرب ہو گئے تھے کہ یارسول اللہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ سارے مراحل سے گذر کر فیصلہ فرمادیا کہ ٹھیک ہے، واپس جائیں

10-سنن الترمذی،کتاب الوصایا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،باب ماجاء فی الضرار فی الوصیۃ

گے۔ حضور نے اعلان فرمایا: احرام کھول دو اور جانور جو لائے ہو ذبح کرو اور کل واپسی ہو گی۔ کوئی بھی نہیں کر رہا، یااللہ ! بخاری کی روایت [10] ہے، لوگ سناٹے میں ہیں کہ یہ کیا ہو گیا ہمارے ساتھ ! ہم تو عمرہ کرنے آئے تھے اور عمرہ کیے بغیر واپس جا رہے ہیں اور ہمیں حکم ہے کہ جانور ذبح کرو، احرام کھولو، واپس چلتے ہیں۔ بخاری کی روایت میں ہے کہ حضور پریشان ہو گئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ سوچیں ذرا آپ بھی کہ حضور فرما رہے ہیں کر دو اور بیٹھے ہیں لوگ۔ پریشانی کے عالم میں خیمے میں گئے۔ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پریشانی بھانپ لی ، عرض کیا : لگتا ہے حضور پریشان ہیں۔ فرمایا یہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کیا مسئلہ ہے آپ جائیں، اپنا جانور ذبح کریں، احرام کھول کے کپڑے پہنیں، سب کر لیں گے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا مشورہ دے رہی ہیں، حضور نے مشورے پہ عمل کیا اور وہی ہوا جو ام سلمہ نے کہا تھا۔ تو میں نے تیسری بات یہ عرض کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وراثت کا حق دیا ہے، علم کا حق دیا ہے، رائے کا حق دیا ہے۔ اور ایک بات کا اضافہ کروں گا اس میں کہ اس وقت کہیں طلاق کا حق تھا کہیں نہیں تھا۔ آج بھی ہندوؤں میں طلاق کا حق نہیں ہے۔ کیتھولک عیسائیوں میں نہیں ہے۔ اور بھی کہیں نہیں ہے۔ بہت سے لوگوں میں مشروط ہے، غیر مشروط ہے لیکن طلاق کا حق نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کے اور نکاح کے معاملات میں بھی کچھ اصلاحات کیں۔ اصل میں پہلے تو یہ کیا کہ طلاق کا حق تو مرد کا ہے لیکن عورت کو مطالبہ

11صحيح البخاری،کتاب الشروط،باب الشروط في الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب وكتابة الشروط

طلاق کا حق ہے۔ عورت کو مطالبہ طلاق کا حق دیا۔ جس کو خلع کہتے ہیں۔اور خلع مرد کی صوابدید پر نہیں ہے۔ مغرب جب بات کرتا ہے میں ان سے کہا کرتا ہوں، یہ تم غلط کہتے ہو کہ ہم نے عورت کو مرد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ مرد کو طلاق کا حق ہے، عورت کو مطالبہ طلاق کا حق ہے۔اور مطالبہ طلاق پر فیصلے کی واحد اتھارٹی خاوند نہیں ہے، دو اتھارٹیاں اس کے علاوہ بھی ہیں۔اگر خاوند جبر کر رہا ہے، حق نہیں دے رہا تو حکمین۔"**فابعثوا حکما من اھلہ و حکما من اھلھا**"[11]قرآن پاک کا حکم ہے۔ حکمین کو بھی اختیار ہے۔اور حکمین بھی نہیں کر رہے تو قاضی کو اختیار ہے۔خاوند کے علاوہ دو اتھارٹیاں اور ہیں جو عورت کی شکایات جائز ہونے کی صورت میں تفریق کا فیصلہ کر سکتی ہیں۔اس لیے یہ کہنا کہ عورت کو مرد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے یہ بات غلط ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور قرآن پاک نے عورت کو مطالبہ طلاق کا حق دیا اور اس کے فیصلے میں مرد کو واحد اتھارٹی نہیں مانا، ساتھ دو اتھارٹیاں اور دیں۔ تحکیم کی صورت میں بھی اور قضاء کی صورت میں بھی۔اور عورت کو راستہ دیا کہ وہ اس راستے سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔بلکہ ایک موقع ایسا بھی ہے کہ عورت اگر نکاح کے موقعے پر راضی نہیں ہے بخاری کی روایت [12]ہے کہ ایک خاتون آئیں یا رسول اللہ میرے والد نے میرا نکاح کر دیا ہے، میں راضی نہیں ہوں۔ والد کو بلا کر پوچھا کہ تو نے اس کا نکاح کر دیا ہے؟ جی کر دیا ہے۔اس سے پوچھا تھا؟ نہیں۔ یہ راضی ہے؟ نہیں۔ نکاح ختم۔اس کی رضا کے بغیر کیا ہے تم نے۔ یہ میں نے چند باتیں عرض کی ہیں

12۔النساء:35
13صحیح البخاری،کتاب النکاح،باب اذا زوج ابنتہ وھی کارھۃ فنکاحہ مردود

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو زندگی کا حق، رائے کا حق، علم کا حق، وراثت کا حق اور طلاق کا حق بالواسطہ دیا ہے۔ یہ حضور نے حقوق بحال کیے۔ دو تین باتیں اس دائرے میں عرض کروں گا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سماجیات کی بڑی معلمہ تھیں اور سماج کے حوالے سے بات کیا کرتی تھیں۔ بیسیوں واقعات ہیں۔ یہ قرآن مجید میں چند احکام ہیں جن کا انہوں نے سماجی پس منظر بیان کیا ہے۔ قرآن پاک نے جہاں فرمایا کہ چار تک نکاح۔ بھانجے نے پوچھا اماں جان سمجھ نہیں آرہی بات کی۔ انہوں نے کہا کہ پہلے کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ حضور نے کہا چار سے زیادہ نہیں۔ اور حضرت عائشہ تعبیر فرماتی ہیں کہ یہ عورت پر ہونے والے ظلم کو ختم کرنے کے لیے ہے۔ چار سے زیادہ نہیں اور چار بھی عدل کی شرط کے ساتھ۔ "**فان خفتم الاتعدلوا فواحدۃ**[13]" چار آخری حد ہے۔ طلاق کی کوئی حد نہیں تھی۔ طلاق دی رجوع کر لیا۔ دس دس سال لٹکائے رکھتے تھے۔ قرآن پاک نے کہا نہیں بھئی تیسری طلاق پہ بات ختم۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ یہ بھی عورت پر ہونے والے ظلم کے خاتمے کے لیے تھا۔ یہ ظہار کا جو حکم آیا ہے کہ کوئی اپنی بیوی کو کہے: "انت علی کظھر امی" کہ تو میری ماں کی طرح ہے یا بہن کی طرح ہے۔ اب لٹکا دیا، کوئی پتہ نہیں کہ وہ بیوی ہے یا نہیں ہے۔ یہ بھی قرآن پاک نے کہا کہ نہیں۔ حضرت عائشہ یہ فرماتی ہیں کی یہ بھی عورت پر ہونے والے ظلم کو ختم کرنے کے لیے تھا۔ ایلاء کا مسئلہ "**للذین یؤلون من نساءھم تربص اربعۃ اشھر**[14]" قسم اٹھا دی کہ میں تیرے قریب نہیں آوں گا۔ کئی

14۔النساء:3

15۔البقرۃ:226

سال ایسے ہی گذار دیے۔ قرآن نے کہا کہ چار مہینے کے بعد ختم۔ چار مہینے میں رجوع کرو ورنہ ختم۔ یہ اصلاحات بھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایلاء کا مسئلہ بھی ظہار کا مسئلہ بھی چار سے زیادہ نکاحوں کے خاتمے کا مسئلہ بھی تین کے بعد طلاقوں کے ختم ہونے کا مسئلہ بھی یہ سارے مسائل عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خاتمے کے لیے اللہ تعالی نے بیان فرمائے۔ اور حضور نے اس زمانے میں خاندان کے نظام میں یہ اصلاحات کیں۔ عورت کے حوالے سے۔ عورت کے حقوق کے حوالے سے۔ عورت پر ہونے والے مظالم کے حوالے سے۔ یہ تو سیرت طیبہ ہے، ہمارا آج کا ماحول کیا ہے؟ ہمیں جن مسائل کا سامنا ہے جیسے ڈاکٹر صاحب نے بھی ذکر کیا حقوق کا مسئلہ بھی ہے زیادتیوں کا مسئلہ بھی ہے۔ ہمیں تین مسئلے درپیش ہیں جن کا ہم نے حل تلاش کرنا ہے۔ ہمارے ذمے ہے۔ میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ہم اس میں مسئول ہیں۔ مسائل کا حل تلاش نہیں کریں گے تو اللہ کے ہاں تو مجرم ہوں گے ہی تاریخ کے ہاں بھی مجرم ہوں گے۔ سب سے پہلی بات: اگر تھوڑا سا لہجہ سخت کرلوں کوئی حرج تو نہیں؟ مرد اور عورت انسانی سماج کے دو پہیے ہیں۔ بنیادی مسئلہ ویل بیلنسنگ کا ہے۔ بیلنس نہیں ہے۔ کہیں اس پہیے میں ہوا زیادہ ہے، کہیں اس پہیے میں ہوا زیادہ ہے۔ دو پہیوں میں بیلنس نہ ہو تو گاڑی لڑھکتی ہے۔ ہمارا سب سے بنیادی مسئلہ ویل بیلنسنگ کا ہے کہ ان دو پہیوں میں بیلنس قائم کرنا ہے۔ اس کی بیس کیا ہے؟ خواہشات؟ ہم کیسے بیلنس کرنا چاہتے ہیں؟ دیکھنے والے کیسے بیلنس دیکھنا چاہتے ہیں؟ اور اوریجنل صورتحال کس بیلنس کا تقاضہ کر رہی ہے؟ یہاں پھنسی ہوئی ہے ہماری گاڑی۔ ہم میں سے ہر ایک کا اپنا ایک ویو ہے۔ اپنا ایک نقطہ نظر ہے۔ یوں ہونا

چاہیے۔ نہیں بھائی نہیں۔ مسئلے کا تقاضہ کیا ہے؟ بیلنس ہو گا کیسے؟ میں ایک بات عرض کرنا چاہوں گا، مغرب میں اس وقت مغرب کے دانشور سر پکڑے بیٹھے ہیں۔ فیملی سسٹم کے بکھرنے پہ۔ ہیلری کلنٹن چیخیں مار رہی ہے اور گورباچوف لکھ رہا ہے اور جان میجر لکھ رہا ہے۔ وہ لوگ سر پکڑے بیٹھے ہیں کہ ہمارا فیملی سسٹم کدھر گیا؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ کبھی اس پہ غور کریں۔ میں یہ عرض کروں گا ڈاکٹر صاحب محترم سے کہ یہ مغرب کی ساری باتیں ہم اپنے اوپر کیوں لیتے ہیں؟ ہم مغرب پہ بات نہیں کر سکتے؟ یہ بڑا مسئلہ ہے۔ مغرب کا ہر دانشور فیملی سسٹم کے بکھر جانے کا رونا رو رہا ہے۔ وہ تو اسباب پہ بحث کریں گے یا نہیں، کیا ہم اسباب پہ بحث کر کے یہ نہیں بتا سکتے کہ سبب کیا ہے؟ میرے نزدیک زناء کی اجازت اور عورت اور مرد کا مساوی حق طلاق۔ یہ خاندانی نظام کے بکھرنے کے سب سے بڑے دو سبب ہیں۔ جب تک مغرب اس پہ نظر ثانی نہیں کرے گا فیملی سسٹم واپس نہیں آئے گا۔ میں نے صرف ایک جملہ کہا ہے، اس پہ بحث کی ضرورت ہے۔ مغرب ہمیں کہتا ہے تم یہ کرو یہ کرو، ہم مغرب کو کیوں نہیں کہہ سکتے؟ تم نے یہ غلطی کی یہ نتیجہ بھگتا۔ یہ غلطی کی یہ نتیجہ بھگتا۔ ہمیں یہ بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اپنے مسائل پر بھی بحث کریں۔ اور جو مغرب ہم پر اثر انداز ہو رہا ہے اپنی روایات اور فلسفے کے ذریعے، ہمیں سبوتاژ کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اس کے معاشرے کے سبوتاژ ہونے کے اسباب بھی ہم بیان کریں۔ ہم ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ کیوں نہیں کرتے؟ میں نے عرض کیا ویل بیلنسنگ۔ ایک تو یہ ہمارا بڑا مسئلہ ہے، ہم نے بیلنس دونوں پہیوں کے درمیان قائم کرنا ہے اور بیلنس سوسائٹی کی خواہشات پر نہیں بلکہ اوریجنل حقائق پر۔ کہ مسئلہ حل

کیسے ہو گا؟۔دوسری بات: ہم انتہا پسند ہیں۔ایک طرف یہ انتہاء ہے کہ ہم اپنے کلچرل مسائل کو بھی مذہب کے نام سے تحفظ دے رہے ہیں۔اور دوسری طرف جو عالمی فلسفہ ہے حقوق کا وہ مذہب کو رکاوٹ سمجھ کر نفی کر رہا ہے۔میرے نزدیک ہمارے بہت سے مسائل کی وجہ یہ ہے۔مسئلہ کلچرل ہوتا ہے ہم اس پر مذہب کا لیبل لگا دیتے ہیں ۔اور وہ خود حل ہونے کی بجائے باقی مسائل کو بھی خراب کرتا ہے۔یہ ہمیں تجزیہ کرنا ہو گا۔اور ہر علاقے کے اپنے کلچر کے حوالے سے، کلچرل فرق زمانے کا بھی ہے، علاقے کا بھی ہے۔ابھی کل لاہور میں مفتیان کرام کی ایک مجلس تھی تو اس میں مجھے گفتگو کے لیے کہا گیا، میں نے کہا حضرات علمائے کرام! اس بات کا یہاں ایک حصہ نقل کر دیتا ہوں۔اڑھائی تین سو مفیان کرام جمع تھے موضوع تھا کہ افتاء کے تقاضے کیا ہیں؟ میں نے کہا یار بات سنو! آپ کے پاس امریکہ سے ایک مسئلہ آیا ہے، استفتاء آیا ہے، تو آپ یہاں کتابیں دیکھ کر فتوی دے رہے ہیں۔امریکہ کا عرف اور ہے، انڈیا کا عرف اور ہے ، برطانیہ کا عرف اور ہے، ہمارا عرف اور ہے۔بلکہ پاکستان میں بھی لاہور کا عرف اور ہے کراچی کا اور ہے۔یہ جو عرف کا فرق اور کلچر کا فرق گڈ مڈ ہو گیا ہے نا پہلے تو ہمیں مذہب اور کلچر میں فرق کرنا ہو گا۔ہم بہت سے مسائل میں کلچر اور مذہب میں فرق نہیں کر رہے۔ہمیں یہ واضح کرنا ہو گا۔پھر کلچر کلچر میں فرق ہے، ویسٹ کا کلچر اور ہے ایسٹ کا کلچر اور ہے، ہمارا کلچر اور ہے۔اس میں سے کون سی بات قابل قبول ہے کون سی نہیں۔اور تیسری بات یہ کہ ہم نے بہت سی چیزوں کو گڈ مڈ کر رکھا ہے۔جو مسائل نصوص قطعیہ ہیں، نصوص صریحہ ہیں، وہاں تو ٹھیک ہے کہ قرآن پاک کی نص قطعی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے۔اجماع امت چلا آرہا ہے۔لیکن جن

مسائل میں ہم اجتہاد کی جائز حدود میں اور جائز دائروں میں رہ کر گنجائش پیدا کر سکتے ہیں وہاں بھی جب ہم اڑ جاتے ہیں تو مسئلہ خراب ہو جاتا ہے۔ ہمیں ایڈجسٹ ہونا ہو گا، جائز حدود میں ہونا ہو گا۔ جائز شرائط کے ساتھ ہونا ہو گا۔ اصول کے دائرے میں رہتے ہوئے، اجتہاد کے جو مسلمہ اصول ہیں ان کے دائرے میں رہتے ہوئے۔ لیکن ایڈجسٹمنٹ کا ذہن تو پیدا کریں۔ ہم یا مکمل نفی اور یا مکمل قبول اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک طرف مکمل قبول اور ایک طرف مکمل نفی۔ نہیں۔ ہمیں اپنے علمی دائرے کو بڑھانا ہو گا اور علمی رویے پر بھی نظر ثانی کرنی ہو گی۔ ہمارے اداروں کو، جامعات کو، بڑے دینی مدارس کو، اسلامی نظریاتی کونسل کو بھی آپ کی سیرت چیئر اور اس جیسے اداروں کو یہ دو فرق واضح کرنے ہوں گے۔ ایک یہ کہ کلچر اور مذہب کے درمیان حد فاصل کیا ہے؟ ایک یہ کہ بین الاقوامی معاہدات میں کون سی باتیں ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہیں؟ کون سی باتیں ہم ایڈجسٹ کر سکتے ہیں؟ یہ بھی آپ کو واضح کرنا ہو گا۔ اور پھر امت کی رہنمائی کرنی ہو گی۔ میں پھر خیر مقدم کروں گا، میں تو ایک عرصے سے کہہ رہا ہوں کہ سیرت کا مطالعہ سماجی ضروریات کے حوالے سے کیا جائے۔ یہ سیرت چیئر بھی اس حوالے سے اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ میں ایک بار پھر خیر مقدم کروں گا، شکریہ ادا کروں گا۔ میرے ایک پرانے خواب کی تعبیر ہے کہ سیرت پہ بات کریں، سماجیات کے حوالے سے کریں، معاشرتی مسائل کے حوالے سے کریں۔ آج کی سوسائٹی کی ضروریات کے حوالے سے کریں۔ خدا کرے کہ ہمارا یہ عمل اس سلسلے میں پیش رفت کا ذریعہ بنے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

تبصرہ جات وسوالات

پروفیسر ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمان

یہ وہ بنیادی اصولی اسلام کے احسانات ہیں جن کا اجمالا حضرت مولانا نے ذکر فرمایا ہے، لیکن میری سوئی وہیں پہ اٹکی ہوئی ہے۔ایک تو آخر میں انہوں نے خود اس کا ذکر فرمایا کہ ہمیں کلچر میں اور مذہب میں فرق کرنے کی ضرورت ہے۔اور آج کی اس نشست کا جو بنیادی مقصد تھا وہ تو پورا ہوا آپ کی گفتگو سے لیکن ابھی جو سوالات کی صورت میں تشنگی باقی ہے اور وہ ان شاءاللہ پوری ہو جائے گی وہ یہ ہی ہے کہ کلچر کی وجہ سے، تہذیب اور ثقافت کی وجہ سے جو مذہبی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں، سیرت طیبہ کی روشنی میں ان کا حل کیونکر ممکن ہے؟ یہ وہ بنیادی چیز ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے بھائی خورشید ندیم صاحب اور ڈاکٹر عرفان صاحب اور اگر ہماری بہن اس وقت آن لائن ہیں تو وہ سوالات اٹھائیں گی۔اور وہ مسائل دیکھیے جی میں ابتداء میں یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں۔وراثت کے مسئلے پہ بھی لوگوں نے گفتگو کی ہے، پردہ ہے، اس پہ کتابیں لکھ ڈالی گئی ہیں۔آج جو مغربی ممالک میں ہماری مسلمان بہنیں رہائش پذیر ہیں ان کے لیے کیا دائرہ کار ہے؟ کس حد تک وہ اپنے مذہب کی پابندی کرتے ہوئے وہاں کی عملی زندگی میں شریک ہو سکتی ہیں؟ یہ وہ سارے مسائل ہیں جیسے حضرت نے فرمایا کہ ان پر سوچنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے۔اور یہ جو بنیادیں آپ نے ارشاد فرمائی ہیں یہ تو الحمدللہ ثم الحمدللہ علی ذالک ہماری ایمانیات کا حصہ ہیں، ہم اس پہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ احسانات ہیں نوع انسانی پر اور بالخصوص طبقہ نسواں پر جس کی کوئی اور مثال نہیں ہے۔ لیکن زمانے کے گذرنے کے ساتھ پھر جو فکری تبدیلیاں آئی ہیں یا سماج کی تبدیلیاں آئی ہیں، ثقافت کی تبدیلیاں آئی ہیں اور اس کی وجہ سے ہماری بہنیں بچیاں مختلف مسائل سے دوچار ہیں۔ اب یہاں میری بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں، اب دیکھ لیں کہ ان کے ذہن میں بھی پردے کی مختلف ڈیفینیشنز ہیں۔ حضرت علامہ صاحب جیسے مفکرین سے ہم نے استفادہ کرنا ہے، روشنی حاصل کرنی ہے کہ کس حد تک ہماری بہنیں اس مسئلے میں مذہب کی روشنی میں، سیرت طیبہ کی روشنی میں اپنے لیے کوئی لائحہ عمل اختیار کر سکتی ہیں؟

جناب خورشید ندیم

مولانا زاہد الراشدی شاید وہ واحد شخصیت ہیں اس وقت جن کی مدد سے ہم قدیم فکر اور جدید فکر میں ایک پل تعمیر کر سکتے ہیں۔ میرا اپنا تجربہ بھی یہ ہے کہ اس معاملے میں ان کا کردار ہمیشہ بہت رہنمارہا ہے۔ مولانا کو شاید یاد ہو گا کہ آج سے کوئی سترہ اٹھارہ برس قبل میں نے اسی نوعیت کی ایک نشست کا اہتمام کیا تھا لاہور میں۔ اس میں ایک طرف مولانا کو گفتگو کی زحمت دی تھی، دوسری طرف عورت فاؤنڈیشن اور اس طرح کی جو تنظیمیں ہیں جو عورتوں کے حقوق پر بات کرتی ہیں ان کو بھی مدعو کیا تھا۔ جاوید احمد صاحب غامدی اور ڈاکٹر محمد فاروق خان شہید جیسے لوگ بھی اس میں شریک تھے۔ میں نے اس میں یہ سوال رکھا تھا کہ یہ سول سوسائٹی آرگنائزیشنز جن کو ہم کہتے ہیں جدید دور میں، یہ جب خواتین کے حقوق کی بات کرتی ہیں تو ان کی علماء سے کیا شکایات ہیں؟ اور

مولانا سے میں نے درخواست کی تھی کہ آپ جب خواتین کے حقوق کی بات کرتے ہیں تو جدید جو تنظیمات ہیں اور جدید جو اس طرح کے ادارے ہیں ان کے نقطہ نظر پر آپ کا نقد کیا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ مل کر ہم بحیثیت قوم ایک ایسے لائحہ عمل اور ایک ایسی ترتیب پر متفق ہوسکیں جس میں ممکن حد تک اتفاق رائے پایا جائے۔ مولانا کو شاید یاد ہو گا کہ وہ اس لحاظ سے بڑی مفید مجلس تھی کہ جب وہ ختم ہوئی تو ایک باہمی احترام کے رشتے کے ساتھ۔ مولانا کے نقطہ نظر کو انہوں نے بھی سنا جو عام طور پر علماء کے اس موقف پر نقد کرتے ہیں اور مولانا نے بھی ان کی بات کو اکاموڈیٹ کیا جس کی جھلک ہم آج کی اس گفتگو میں سن رہے ہیں۔ تو آپ کے حسن انتخاب کی داد کہ مولانا سے بہتر شاید کوئی آدمی نہ ہو سکتا جو اس ڈیبیٹ کا آغاز کرتا جس کے سلسلے میں آج ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

مجھے دو باتیں عرض کرنی ہیں اور میں چاہوں گا کہ اس میں اختصار پیش نظر رہے اور باقی لوگ بھی اس میں شریک ہوں۔ جو آخری جملہ آپ نے ارشاد فرمایا میں اسی سے ابتداء کروں گا کہ سماج کو سامنے رکھتے ہوئے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ سے کیا رہنمائی مل سکتی ہے؟ اور سماج کو ہم محدود کرتے ہیں ان مسائل تک جو خواتین کے حوالے سے اس وقت زیر بحث ہیں۔ جو میری سماج کی تفہیم ہے وہ یہ بتاتی ہے کہ سماج اصل میں ایک تاریخی جبر کا نام ہے۔ سماج کہاں کھڑا ہوتا ہے اس کا تعین میں اور آپ نہیں کرتے۔ وقت خود کرتا ہے۔ اور جب وقت خود تعین کرتا ہے تو اس کے بعد انسان کے طور پر اپنی بقاء کے لیے یہ فطری تقاضہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ ایک ہم آہنگی

پیدا کریں۔ وہ اگر نہیں پیدا کریں گے تو ہماری بقاء خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ زندگی کا ایک عمومی اصول ہے جو ہماری فطرت کا حصہ ہے، اس پر اگر ہم زیادہ گفتگو کریں گے تو شاید وہ تحصیل حاصل ہوگا۔ مثال سے میں اپنی بات واضح کرتا ہوں کہ یہ جو اولاد نرینہ کا تصور ہے یہ کہاں سے پیدا ہوا؟ ایک برتری کہ آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہو تو خوشی کا اظہار اور اگر بیٹی پیدا ہو تو افسردگی۔ کہ بیٹا یہ آپ کا ایک ایسٹ (اثاثہ) ہے جبکہ بیٹی ایک لائیبلٹی (ذمہ داری) ہے۔ یہ احساس کہاں سے پیدا ہوا؟ یہ پیدا ہوا ایک ایسی قبائلی معاشرت میں جس کے اندر سوسائٹی میں قوت کا جو مرکز تھا وہ آپ کی جسمانی قوت تھی، آپ کے بازو اصل میں طے کرتے تھے کہ سماج کے اندر آپ کی حیثیت کیا ہے۔ یہ ایک فطری اصول ہے کہ جس کے پاس زیادہ بازو ہوں گے لڑنے والے، جس کے پاس زیادہ ہاتھ ہوں گے مشقت کرنے والے وہ زیادہ طاقت ور ہوگا یعنی جسمانی قوت ہے ایک قدر کے طور پر مستحکم ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں لازمی طور پر یہ بات ہوئی کہ جس کے بیٹے زیادہ ہیں اس کی قوت زیادہ ہے۔ لہذا اولاد نرینہ کی خواہش یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ آج کے دور میں جس کے پاس ڈالرز زیادہ ہیں یعنی ڈالر ایک قدر ہے جو آپ کے وسائل کا تعین کرے گی۔ ڈالرز زیادہ ہے تو آپ کی بحیثیت قوم یا بحیثیت فرد جو معاشی حیثیت ہے وہ زیادہ مستحکم ہو گی۔ روپیہ ہے تو نہیں ہے۔ اسی طریقے سے اولاد نرینہ کا تصور یہاں سے پیدا ہوا کہ قوت کا مرکز جسمانی طاقت ہے اور وہ دست و بازو جس کے پاس زیادہ ہیں وہ زیادہ قوت والا ہے۔ لہذا بیٹوں کی خواہش ہوئی، لوگوں نے کہا کہ بیٹے زیادہ ہونے چاہییں۔ لیکن جب صنعتی انقلاب آیا، تبدیلی آئی سوسائٹی کے اندر تو اب قوت کا مرکز انسان کے جسم سے نکل کر اس کے دماغ میں چلا گیا۔ جس کے پاس علم زیادہ ہے، جس

کے پاس نئے وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت زیادہ ہے۔اور وقت نے بتایا کہ اس صلاحیت میں عورت مرد سے کم ثابت نہیں ہوئی۔ جس میدان میں بھی اس نے ہاتھ ڈالا، اس نے بتایا کہ وہ مرد سے بہتر بھی ہو سکتی ہے۔ بعض مردوں سے بعض عورتیں بہتر ہو سکتی ہیں۔اور کم از کم بحیثیت مجموعی اس کی جو حیثیت ہے وہ کم نہیں۔اب اولاد نرینہ کا تصور تبدیل ہونے لگا، اب بیٹا ہے یا بیٹی ہے اس تصور کی حیثیت زیادہ نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ یہ جو سماجی ارتقاء ہے یہ آپ کے تصورات پر اثرانداز ہوتا ہے اور آپ نے خود مثال دی کہ کیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ آئے تو مدینے کی جو معاشرت تھی اس کی اپنی اقدار تھیں جو اثرانداز ہوئیں خواتین کے رویے پر۔اور آپ نے بتایا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے اس کو اکاموڈیٹ کیا اس سارے تصور کے اندر اور لوگوں کو سمجھایا کہ سماجی تبدیلی آچکی ہے، آپ اس کو قبول کریں گے تب آپ آگے چل سکیں گے۔ تو گویا اس معنوں میں یہ آپ کی سنت ہے۔اور یہ آپ نے سکھایا کہ کیسے سماج کے ساتھ کمپیٹی بیلٹی آپ نے پیدا کرنی ہے۔ میری گذارش یہ ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر دین کی تفہیم کی جو روایت آگے بڑھی اس میں اس پہلو کو نظرانداز کیا گیا۔ جو کچھ آپ نے فرمایا اس کا جب ہم اطلاق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سنت سے ہم کوئی زیادہ استفادہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جو ساری گفتگو آپ نے فرمائی اکثر علماء جب اصولی گفتگو کرتے ہیں کہ اسلام نے بڑے حقوق دیے، عورتوں کو بڑے حقوق حاصل ہیں۔ لیکن جب اطلاق کا پہلو آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نہیں۔ ہم کہیں اور کھڑے ہیں۔اور علامہ اقبال یاد آجاتے ہیں کہ :

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قُرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

معلوم یہ ہوتا ہے جیسا کہ آپ نے بتایا کہ روایت حدیث کے اندر خاتون کی گواہی یعنی روایت کے ضعف اور اس کی صحت کے باب میں خاتون کی گواہی مرد کی گواہی سے کم نہیں ہے، برابر ہے۔ لیکن آج جب ہم اپنی تعزیرات، حدود اور قوانین کے نفاذ کی بات کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ نہیں، عورت کی گواہی مرد کے برابر نہیں ہو سکتی۔ اور حدود میں تو سرے سے قابل قبول ہی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں تو ہم گواہی پوری مان رہے ہیں، روایت دین کے اندر، حالانکہ وہ معمولی بات نہیں ہے۔ دین کی روایت کے اندر کسی غیر اہم چیز کا اہم تر ہو جانا اور آپ جانتے ہیں کہ اس سے آپ کا دین کا پورا اسٹر کچر برباد ہو سکتا ہے۔ کسی بدعت کو آپ سنت بنا دیں، کسی سنت کو آپ بدعت بنا دیں ایک روایت کی بنیاد پر۔ یہ اتنا نازک مسئلہ ہے۔۔ اس میں آپ نے بتایا کہ سنت کی تاریخ میں خاتون سے بڑھ کر بڑی عالمہ قرآن و حدیث کی پیدا نہیں ہوئی۔ کہنا یہ ہے کہ یہ اطلاق کی جب بات آتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ نہیں، عورت کی گواہی ہم قبول نہیں کریں گے، بعض معاملات میں سرے سے نہیں کریں گے اور اگر کریں گے بھی تو اس کی آدھی کریں گے۔ آپ جانتے ہیں اور میں بھی تھوڑا بہت جانتا ہوں کہ یہ کہاں سے اخذ ہوتا ہے لیکن وہی "تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پاژند"۔ دوسری چیز مثلاً دیت ہے، آپ نے فرمایا کہ کیسے جانوں کا تحفظ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ جو آدمی اس روح کو جاننا چاہتا ہے جو سنت اور دین اسلام سکھاتا ہے عورت کے حقوق کے

بارے میں۔ تو صاف واضح ہو رہا ہے کہ کیسے ڈیپارچر ہے؟ عہد جاہلیت سے ایک عہد کی طرف کہ جہاں عورت کی جان ومال کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سٹیٹس کو بڑھا رہے ہیں۔ لیکن ہم نے اس سٹیٹس کو پھر وہیں ٹھہرا دیا، بڑھنے نہیں دیا۔ دیت کی بات ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ عورت کی دیت تو آدھی ہے پوری دیت نہیں ہو سکتی۔ اچھا دوسری طرف سزاؤں کا نفاذ جب ہم کریں گے تو پھر ہم فرق نہیں کریں گے۔ سو کوڑے مرد کو لگیں گے تو سو ہی عورت کو بھی لگیں گے۔ چور کا ہاتھ کٹے گا تو مرد کا بھی کٹے گا اور عورت کا بھی کٹے گا۔ لیکن گواہی اس کی ہم پوری نہیں مانیں گے، دیت اس کی ہم آدھی قبول کریں گے۔ گویا ہمارے نزدیک اس کی جان کی حیثیت آدھی ہے۔ اس کی قانونی حیثیت آدھی ہے کیونکہ اس کی گواہی پوری ہم اپنے نظام عدالت میں قبول نہیں کر رہے۔ میری گذارش یہ ہے کہ یہ جو آپ نے آخر میں فرمایا اس کا جو تقاضہ ہے اور وہی سروائول کا طریقہ ہے اس عہد میں۔ ہمارے بڑے مسائل جو درپیش ہو رہے ہیں اس میں ہم جانتے ہیں کہ سماج تبدیل ہو گیا ہے۔ ایک جیسے میں نے کہا کہ اولاد نرینہ کا تصور بدلا۔ دوسرا یہ ہے کہ اب عورت معیشت کے عمل میں مرد کے برابر شریک ہے۔ گھر کی معیشت اب چل ہی نہیں سکتی اگر ایک ہی آدمی کمانے والا ہو۔ پرانا دور آپ کو معلوم ہے زرعی معاشرت کا ختم ہو گیا، بدل گیا ہے سارا۔ خاتون بھی نہ کمائے ساتھ تو گھر نہیں چل سکتا۔ اچھا جب وہ کمائے گی تو وہ فیصلہ سازی میں بھی شریک ہو گی یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ کما کے تو وہ لائے لیکن فیصلہ سازی میں وہ شریک نہ ہو۔ یہ فطری اصول ہے۔ اب تمدنی صورت حال بدل گئی، فیصلہ سازی میں اب وہ شریک نہیں ہو رہی۔ تھوڑی سی مہربانی ہم نے کی کہ اسے ووٹ کا حق

دیدیا لیکن ابھی ہم اسے سربراہ مملکت ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جبکہ روایتی موقف تو ہمارا یہ ہے کہ ہم کابینہ میں بھی اس کو بٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے تمام لوگ اس میں شریک ہیں۔ اسی طریقے سے جو پردے کی تعبیر ہے ہمارے ہاں، پردے کی اصطلاح فقہ میں اور آپ جانتے ہیں کہ اس میں جو ڈیبیٹ ہے ساری کی ساری، آپ بھی جانتے ہیں اس دیہی معاشرت کو، میں بھی جانتا ہوں کہ وہ جو تصور پردے کا ہم دیتے ہیں جو ہماری تفہیم ہے اس کا کبھی اطلاق ممکن ہی نہیں۔ پنجاب کے دیہات میں آپ چاہیں بھی تو اس کا اطلاق نہیں کر سکتے۔ ختم نبوت کا جو مفہوم ہم نے جانا وہ یہ ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر دین مکمل ہو گیا اور چونکہ اس کو قیامت کی صبح تک رہنا ہے، تو یہ لازم ہے کہ اس کے اندر وہ تمام امکانات جو پوشیدہ ہیں آنے والے ادوار میں ان کا پوری طرح سے ادراک ہو۔ وہ جو معاشرت پنجاب کی وجود میں آنے والی ہے اس کا ادراک ہو۔ پردے کی وہ تعبیر جو ہم اختیار کرتے ہیں اس کا کہیں نفاذ ممکن ہی نہیں، نہ ہوتا ہے، آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے بچپن سے دیکھا، ہم نے بھی دیکھا کہ کیسے زراعت کے بڑے حصے کا انحصار خواتین پر ہے پنجاب میں اور باقی کئی معاشروں میں۔ تو کہنا یہ ہے کہ مسئلہ پھر وہیں پیدا ہوتا ہے۔ اصولی گفتگو تو ہم بہت اچھی کرتے ہیں کہ اسلام سے بڑھ کر کسی نے حقوق نہیں دیے۔ جب اطلاقات کی بات آتی ہے اور یہ میں نے جو آپ کے سامنے مثالیں رکھیں یہ گلی بازار کے لوگوں کی رائے نہیں ہے ۔آپ کے حدود قوانین اور آپ کے جو تعزیراتی قوانین ہیں ۔اس ملک کی جید اور شیخ الاسلام کہلانے والی شخصیات جیسے لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں۔ تو یہ آپ کا مغز ہے۔ تو یہ کوئی گلی بازار کے لوگوں کی میں بات نہیں کر رہا میں آپ کے ان اہل علم کی

بات کر رہا ہوں جو سرخیل ہیں اس سارے قافلے کے۔تو اس صورت حال میں آپ مجھے بتایے کہ یہ ساری تعبیرات جو ہم اختیار کیے ہوے ہیں، کیا یہ سروائول کے اس پیمانے پر پوری اتر پائیں گی جس کی آج کے عہد میں ضرورت ہے ؟اور وہ ساری بحثیں جو ہم اٹھا رہے ہیں کیا اس طرح سے ہم کر پائیں گے ؟وہی بات کہ اس قافلے کو وہاں ہم نے روک رکھا ہے جو اقبال نے کہا تھا کہ ہند کے میخانے بند ہیں صدیوں سے ان میخانوں کو اب کھلنا چاہیے میرا خیال ہے۔اور اگر ہم نہیں کھولیں گے تو وہی سروائول کا جو ایشو ہے ،ہمارے ساتھ رہے گا۔ میری تو یہ چند گذارشات ہیں۔میرا خیال یہ ہے کہ اطلاق کی طرف ہم آتے ہیں یا جیسے آپ نے فرمایا سماج کی طرف۔تو یہ ساری چیزیں ہیں جنہیں ہم پیش نظر رکھیں۔اسی پہ اکتفا کرتا ہوں ،تاکہ باقی لوگ بھی اس بحث میں شریک ہوں۔ایک مرتبہ پھر آپ کا شکریہ

مولانا زاہد الراشدی

بہت بہت شکریہ ! آپ نے بہت اہم امور کی نشاندہی فرمائی۔ایک تو مسائل کی فہرست ہے جو آپ نے بیان فرمائی، میرے پاس شاید اس سے زیادہ لمبی ہو۔مسائل کے لیے میں نے عرض کیا کہ ہمیں بیٹھ کے ان کا حل نکالنا ہے۔ہماری یہ روایت چلی آرہی ہے ،ہر دور کے فقہاء نے یہ حل پیش کیے ہیں، پہلے روایت اور تھی، سرخسی کا دائرہ اور تھا ،عالمگیری کا دائرہ اور تھا، شامی کا اور تھا۔ہماری یہ روایت چلی آرہی ہے کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق ہم نے تبدیلیاں قبول بھی کی ہیں، تبدیلیاں کی بھی ہیں۔اگر اس وقت ہم نہیں کر رہے تو ہماری کوتاہی ہے۔ہمیں اجتماعی طور پر مسائل کا حل نکالنا

چاہیے۔ مسائل کی جو فہرست آپ نے دی ہے، اتنی فہرست اور بھی ہے ہمیں ان مسائل کا حل نکالنا ہو گا علمی بنیاد پر۔ لیکن دوسرا ہمیں اس سلسلے میں یہ دیکھنا ہو گا کہ اصول کیا ہے؟ سماج کا ارتقاء۔ کیا سماج کے ارتقاء کی ہر بات کو ہم نے لازمی طور قبول کرنا ہے؟ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس سماج کا سامنا تھا وہ اس وقت کا ارتقاء یافتہ سماج تھا۔ اس وقت کا ترقی یافتہ سماج وہی تھا۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سماج کی ساری تبدیلیوں اور ارتقاء کو من وعن قبول کیا ہے؟ نہیں۔ بنیادی طور پر جو قابل قبول ہو گا اس کو قبول کریں گے جو نہیں ہو گا اس کو نہیں کریں گے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی روایات کو قبول کیا ہے اور بہت سی روایات کو مسترد کیا ہے۔ جن کو مسترد کیا ہے وہ بھی اس وقت کی ترقی یافتہ اقدار تھیں۔ سماج کی اقدار تھیں۔ تو میں نے اصول کے طور پر دو باتیں عرض کی ہیں۔ ایک بات یہ کہ سماجی ارتقاء کی ہر بات کو نہ ہم نے قبول کرنا ہے نہ رد کرنا ہے۔ اور جو بات قابل قبول ہے وہ قبول کرنی ہے جو نہیں ہے تو اس پہ ہم کہدیں گے کہ نہیں بھئی۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ تو قابل قبول ہونے اور قابل قبول نہ ہونے کے لیے میں نے یہ عرض کیا کہ ہماری جو علمی روایت ہے، علمی اصول ہیں اس کے دائرے میں مسائل پہ بحث کی ضرورت ہے۔ میں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں۔ ابھی یہ پردے کا مسئلہ پھر چھڑ گیا ہے۔ افغانستان اور امریکہ کے درمیان۔ یہ میں موقف کے طور پر نہیں عرض کر رہا، مثال کے طور پر عرض کر رہا ہوں۔ مجھ سے بعض افغان علماء نے رابطہ کیا کہ اس میں کیا کرنا ہے؟ میں نے کہا آپ حنفی ہیں۔ وہ احناف ہیں سارے۔ میں نے کہا احناف متقدمین کا موقف کیا ہے؟ چہرے کا پردہ ضروری ہے؟ تو آپ کے پاس گنجائش ہے۔ یہ مسائل کے حل کے

لیے راستے ہمیں خود اپنے علمی ذخیرے میں ملیں گے۔ لیکن بحث و مباحثہ کے ذریعے، مکالمے کے ذریعے، آپس میں افہام و تفہیم کے ذریعے اور اس میں یہ تاثر بھی ہمیں قائم رکھنا ہوگا کہ ہم یہ فیصلے علمی بنیاد پہ کررہے ہیں کسی کے کہنے پہ نہیں کررہے۔ اب یہ تاثر جو پیدا ہوگیا ہے کہ فلاں مسئلہ فلاں کے کہنے پہ کررہے ہیں۔ اس تاثر کو رد کر کے ہمیں علمی بنیادوں پر مسائل پہ بحث بھی کرنی چاہیے، تبادلہ خیال بھی کرنا چاہیے، حل بھی نکالنا چاہیے اور اگر ارتقاء کے حوالے سے کوئی تبدیلی ضروری ہو تو مجھے کوئی انکار نہیں ہے۔ لیکن اپنے علمی دائرے میں رہ کر۔

ڈاکٹر عرفان شہزاد

بہت شکریہ! میں جو باتیں کرنا چاہتا تھا ان میں سے بیشتر تو خورشید ندیم صاحب نے ذکر کردیں۔ جب ہم یہ مرد اور عورت کی بیلینسنگ کی جیسے آپ نے فرمایا بات کرتے ہیں ، تو چونکہ ہمارا مخاطب دور حاضر کا ذہن ہے، ہمارا جو بیان ہوتا ہے وہ ایسے ہوتا ہے جیسے یہ مرد کی عنایت ہے کہ ہم نے فلاں فلاں حق دیکر عورت پہ احسان کردیا، اس کی مشکلات کو کم کردیا۔ یہ بجا ہے، میں بھی اس سے اتفاق رکھتا ہوں، لیکن وہ جو ذہن آپ کا مخاطب ہے وہ عنایت کو لے کر نہیں چلتا، وہ کہتا ہے کہ آپ مجھ پہ عنایت کررہے ہیں؟ عورت جو ہے وہ یہ کہتی ہے کہ آپ ہم پہ عنایت کررہے ہیں؟ ہم برابر کے پارٹنر ہیں، ہمیں ہمارا حق اگر دینا ہے تو عنایت کر کے نہ دیں۔ اب اسے یہ سمجھانا کہ کس جگہ پہ جو عنایت ہے وہ آپ کی رعایت ہے، اس کے لیے ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے کہ جس کے ذریعے اسے ہم یہ سمجھا سکیں کہ یہ پورا فریم ورک کیا ہے؟ جس کے اندر یہ ساری چیزیں

اپنی جگہ پہ بیٹھتی ہیں۔ تو یہ فکری مسائل ہیں جن کو ایڈریس کرنا ہے۔ ہم اس کو صرف عنایت کے نقطہ نظر سے سمجھا نہیں پائیں گے اس پہ ہمارا سمجھانے کا طریقہ مختلف ہونا چاہیے۔ دوسری بات جس کی طرف آپ نے خود اشارہ فرمادیا کہ تہذیب اور مذہب میں یا ثقافت اور مذہب میں فرق کرنا چاہیے۔ وہ ہمارے ہاں بدقسمتی سے عام طور پر ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ ہمارے ہاں عورت کا جو تصور ہے وہ ہمارے لوکل کلچر سے اٹھا ہے، جس میں مثال کے طور پر عورت کی آواز کا پردہ ہے، عورت کا چہرہ نامحرم کبھی ساری زندگی مت دیکھے، یہ اس قسم کے تصورات آپ کے علم میں ہی ہے کہ یہ ہندو ایلیٹ کلاس یعنی اشرافیہ کے ہاں پایا جاتا تھا۔ خاص طور پر راجپوت گھرانوں میں جو شاہی خاندان ہوتے تھے ان کے ہاں یہ تصور پایا جاتا تھا۔ پھر اسی چیز کو ہمارے ہاں ایک آئیڈیل سمجھ لیا گیا کہ یہ تو بہت ہی اعلیٰ ہے۔ پھر کچھ روایات سے، کچھ ازواج مطہرات کے ساتھ جو ان کا خصوصی پروٹوکول تھا اس سے کچھ سند حاصل کر کے اس کو جنرلائز کر دیا گیا اور عورت کے لیے بڑے مسائل پیدا کر دیے ہم نے۔ پھر مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کی بہشتی زیور، مولانا نے بڑی شفقت سے یہ کتاب لکھی ہے اپنے دور کے نقطہ نظر سے ،لیکن اس سے مذہب کی سند مل گئی کہ آئیڈیل عورت یہ ہی ہے کہ جو ایک راجپوت شاہی خاندان کے محل سرا میں بیٹھی ہوئی ہے، جس پر کسی نامحرم کی نظر بھی نہیں پڑتی۔ اب حقیقت میں تو عورت اس طرح چل نہیں سکتی تھی لیکن اس طرح دوسری عورتوں کو ہم نے احساس کمتری کا شکار بنادیا کہ آئیڈیل تو وہ تھا۔ تمہارے ہاں مسائل ہیں تو گھر سے نکلنے کی ضرورت پڑ گئی پردہ زیادہ نہیں کر سکتی تو تمہیں اس احساس کمتری کے ساتھ جینا ہے کہ وہ مثالی عورت تم نہیں ہو۔ جو خواتین اتنا سخت کلچرل پردہ اختیار

کرلیتی ہیں وہ ایک احساس برتری کے مقام پر ہوتی ہیں۔تو ہم رعایت دیتے ہیں اس خاتون کو جو مجبوری میں ہے اور اس طرح سخت پردہ نہیں کر سکتی لیکن اس کے ساتھ ہم اس کو دوسرے مقام پر رکھتے ہیں۔اب ہم نے یہ بتانا ہے کہ یہ تو ہم نے اس تہذیب سے لے کے اس تہذیب پہ ڈال دیا ہے۔تو اس قسم کے کچھ مسائل ہیں جن کی وجہ سے مشکلات ہیں۔دوسری بات جو میں عرض کرنا چاہوں گا کہ سیرت سے جب ہم خواتین کے متعلق کوئی بات اخذ کرتے ہیں تو اس میں بھی ہمارا جو نقطہ نظر ہوتا ہے وہ ہماری روایت کے اندر ہی محدود رہتا ہے جو چلی آرہی ہے،اور خود سیرت سے جتنی روشنی مل سکتی ہے وہ بھی ہم حاصل نہیں کرتے۔آپ اہل علم ہیں،آپ کے مطالعے میں مولانا ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی صاحب کی کتاب "رسول اکرم اور خواتین ایک سماجی مطالعہ" آئی ہوگی۔جس میں وہ بتاتے ہیں کہ اس زمانے کی ہر ہر چیز میں، تمام سماجی سرگرمیوں میں خاتون عملی طور پر شریک تھی۔اب مولانا خود بھی ایک روایتی عالم ہیں مولانا ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی صاحب، لیکن خود وہ لکھتے ہیں کہ مخلوط اجتماعات ہوا کرتے تھے صحابہ اور صحابیات کے۔اور ایک جگہ پہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ آیت حجاب کے نازل ہونے کے بعد خواتین کی گھر سے باہر کی جو ایکٹوٹیز ہیں وہ مجھے زیادہ نظر آتی ہیں۔اسی طرح انہوں نے اور بھی بہت سی چیزیں لکھی ہیں جس سے مذہب کے لحاظ سے ایک بالکل ہی مختلف نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔اس سے یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے سیرت میں سے بھی صرف انہی چیزوں کو اختیار کرکے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے جو ہمارے لوکل کلچر کے حساب سے بھلی معلوم ہوتی تھیں، میچ کرتی تھیں، اس طرح ہم نے سیرت کے ذخیرے سے حاصل ہونے والی روشنی سے بھی اپنے آپ کو

محروم کیا ہے۔ تو جو چیزیں خورشید ندیم صاحب نے بیان کیں، فقہی لحاظ سے، شرعی لحاظ سے جو خواتین کے مسائل ہیں۔ تہذیبی لحاظ سے جو کچھ بات ہم نے عرض کی۔ اور پھر کلامی اعتبار سے کہ ہمیں سمجھانا ہے جیسے آپ نے فرمایا کہ ہر چیز قبول نہیں کی جا سکتی ۔جب قبول نہیں کی جا سکتی تو پھر اس کے لیے ہمیں وجہ بتانی پڑے گی۔ ایک نئے علم کلام کی بھی ضرورت ہے۔ ان تمام پہلوؤں کو لے کر ہم آگے چلیں گے تو میرا خیال ہے کہ ہم بہتر طریقے سے اپنا کیس پیش کر پائیں گے۔ شکریہ

مولانا زاہد الراشدی صاحب

آپ نے بھی بہت سے مسائل کی بات کی، مسائل کے حوالے میرا موقف یہ ہی ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہی ہے کہ ہمارے درمیان مکالمہ نہیں ہے۔ وہ جو ہمارے ہاں فقہاء کے درمیان مکالمہ اور مکالمے کے نتیجے میں ایک ارتقاء اور تبدیلی ہوتی تھی وہ ہمارے ہاں نہیں ہے۔ اس وقت مسائل کے حوالے سے جتنی کنفیوژن ہے اس کا حل مکالمہ ہے۔ ہم اور آپ بیٹھیں۔ جدید اور قدیم دونوں۔ ہم تو ایک مکتب فکر کے لوگ بیٹھنے کو تیار نہیں ہوتے۔ تمام مکاتب فکر کے لوگ، جدید و قدیم لوگ مکالمے کے لیے مل بیٹھیں۔ ایک بات یاد آ گئی کہ ابھی کل کی مجلس میں میں نے عرض کیا، مجھے کہا گیا کہ ایک لڑکا ملحد ہو گیا ہے۔ میں نے کہا ہو گیا، کس نے کیا ہے؟ مجلس کا ایجنڈا یہ تھا خورشید صاحب، کہ الحاد اور دہریت کے بارے میں بات کرنی ہے۔ میں نے کہا اس کے لیے میرے نزدیک پہلا حل یہ ہے کہ یونی ورسٹی کے جن لڑکوں کو آپ ملحدین اور دہریے سمجھتے ہیں نا ان کے ساتھ مجلس کرائیں، میری کروائیں۔ ان کی بات سنیں کہ وہ

کیا کہہ رہے ہیں ؟ سوالات ہم نہ طے کریں ان کے ،ان سے پوچھیں۔ان سوالات کے اسباب تلاش کریں۔ان اسباب پر غور کریں۔اس کے بغیر کوئی مکالمہ نہیں ہے۔ ہمیں مکالمے کا ماحول پیدا کرنا ہو گا۔ قدیم وجدید کا بھی۔ آپس میں مختلف مکاتب فکر کا بھی اور اپنی نئی نسل کے ساتھ بھی۔ایک بات آپ نے جو فرمائی اس حوالے سے عرض کرنا چاہوں گا کہ قرآن پاک کی اصطلاح اور ہے۔ میاں بیوی تو میاں بیوی ہیں، قرآن پاک تو ذوی القربیٰ کو بھی جب دیتا ہے تو حق کہہ کر دیتا ہے۔"آت ذاالقربی حقه"[15] یعنی رشتے داروں کو ان کا حق دو۔ قرآن پاک احسان نہیں کہتا ان معاملات کو بلکہ حقوق کی بات کرتا ہے۔ قریبی رشتے داروں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی جب بات کرتا ہے تو حق کہہ کر کرتا ہے۔اسی طرح "حق للسائل و المحروم"[16] یعنی سائل اور محروم کا حق ہے۔ لیکن مسائل کے حوالے سے ہمیں بہر حال مکالمہ کرنا پڑے گا اور مجھے اس لیے بھی اس بات کی خوشی ہو رہی ہے کہ مجھے امید ہے کہ سیرت چیئر والے اس مکالمے کا ماحول پیدا کریں گے۔ جتنا مکالمے کا ماحول بڑھے گا ہماری غلط فہمیاں دور ہوں گی اور چھانٹی کر سکیں گے۔ چھانٹی بھی ہم نے ہی بیٹھ کے کرنی ہے کہ کون سی بات کس درجے میں قابل قبول ہے اور کس درجے میں نہیں۔ مکالمے کے ذریعے ہی یہ ہو گا۔اس وقت ہم میں سے ہر ایک اپنا موقف دوسرے کو منوانے کی کوشش کر رہا ہے۔اس سے نکل کر کر مکالمے کا ماحول بنانا ہو گا۔

16۔بنی اسرائیل:26
17۔الذّریات:19

پروفیسر فتح محمد ملک

میں نے آپ سب کی باتیں بہت غور سے سنیں اور بہت کچھ سیکھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میرے ذہن میں مسلمان معاشرے میں عورت کا انقلابی کردار چھایا رہا۔ یعنی بہت کم یہ واعظین بتاتے ہیں ،ذکر کرتے ہیں کہ دنیا میں سب سے پہلا مسلمان ایک خاتون تھی۔ آنحضور جب گھر پہنچے اور انہوں نے اپنی کیفیت بتائی تو سب سے پہلے کون ایمان لایا؟ حضرت عمر فاروق سے بھی پہلے ۔تو یہ ایک خاتون تھیں حضرت خدیجۃ الکبری ،جنہوں نے کہا کہ آپ پیغمبر ہیں اللہ کے ،میں آپ کی پہلی مسلمان ہوں۔ یہ تو اسلام کے آغاز کی بات ہے۔اس کے بعد دیکھیں تو تصوف کا مدرسہ جو بصرہ میں تھا تو کس نے اس کی رہنمائی کی؟حضرت رابعہ بصری نے۔ پھر کربلا آجاتے ہیں۔ تو جناب زینب کس طرح سے للکارتی ہیں یزید کو۔اس کی مثال کہیں ملتی ہے؟ اب یہاں سے میں فورا پاکستان آجاتا ہوں۔ایوب خان نے جب الیکشن کا اعلان کیا تو سید ابوالاعلی مودودی سے لے کے چھوٹی موٹی اور جو سوشلسٹ جماعتیں تھیں ان سب کے سربراہ محترمہ فاطمہ جناح کے قدموں میں جاکر بیٹھ گئے اور اس وقت اٹھے جب انہوں نے کہا کہ ہاں میں اس ڈکٹیٹر کے خلاف تحریک کی قیادت کروں گی۔ یہ مادر ملت ہیں۔ پھر آجایئے دختر ملت بے نظیر بھٹو تک ۔ہر کوئی سمجھا رہاہے لیکن وہ اپنے بچے زرداری صاحب کے حوالے کرکے موت کو دعوت دینے کے لیے آرہی ہیں ،اس چیلنج کو قبول کررہی ہیں۔جب ان سے یہ کہا گیا کہ خدا کے لیے آپ نہ جائیں۔آپ کی جان کو خطرہ ہے، توانہوں نے واجد شمس الحسن سے کہا کہ کتابوں کی اس دکان سے نکل کر سڑک پر جب ہم

جائیں تو کوئی گاڑی مجھے کچلتی ہوئی گذر جائے، یہ ہی زندگی ہے نا؟ میں جاؤں گی جتنا بھی خطرہ ہوگا۔ وہ آئیں۔ جو کچھ ان کے ساتھ ہوا، دہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن پھر جب لیاقت باغ میں جو شہیدوں کا باغ اب کہلاتا ہے۔ اس میں انہوں نے خطاب کرنا تھا ۔سب بتاتے رہے کہ جان کو خطرہ ہے۔ لیکن وہ آئیں اور جان نچھاور کر دی۔ جی چاہتا ہے کہ اللہ کرے کوئی بی بی زینب سے کر بے نظیر بھٹو تک کی زندگی، ان کے عقائد، ان کے تصورات اور ان کی قربانیوں کو سامنے رکھے۔ اور پھر فتووں کی تلاش میں نہ جائے۔ سوچے اپنے گریبان منہ ڈال کے کہ کیا میں مرد ہوں؟ مرد ایسے ہوتے ہیں؟ یا عورت مرد سے افضل ہے؟ وہ زیادہ انقلابی ہے؟ تو مجھے بس صرف یہ سوال چھوڑ کے اور آپ سے ایک ہزار ایک معذرت کے بعد خاموش ہو جانا ہے۔

ڈاکٹر نسیم خان محسود

اتنے سارے اسکالرز کی باتیں سن کر میں نے بہت کچھ سیکھا اور ضروری ہے کہ میں اس پر اپنی زیادہ سے زیادہ پسندیدگی کا اظہار کروں۔ آپ حضرات کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں کوئی سوال کر رہی ہوں یا نہیں۔ لیکن اسلام بہت خوبصورت مذہب ہے۔ اسلام خواتین کو بہت اعلیٰ مقام دیتا ہے۔ ریاست کے بہت خوبصورت قوانین ہیں۔ ان کا نفاذ اگرچہ ایک الگ چیز ہے۔ لیکن سرنے جو بات کی کہ مسئلہ وہاں آتا ہے جب ان میں توازن نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے جو میں سمجھ پارہی ہوں کہ اس کی ذمہ داری کہیں نہ کہیں اس پہ آجاتی ہے جو مرد و عورت میں سے زیادہ طاقت ور اور بااختیار ہے۔ اب جسے طاقت اور اختیار حاصل ہوتا ہے وہ کبھی بھی اسے

چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا بلکہ اسے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا ہے۔ اگر ہم پاکستانی معاشرے کے تناظر میں دیکھیں تو پاور ریلیشن کے بینیفشریز یعنی قوت و اختیار کا منبع ہمیشہ مرد ہی رہے ہیں۔ میں جینڈر یا فیمنزم کے حوالے سے بات نہیں کر رہی بلکہ میں سٹیٹسٹکس یعنی اعداد و شمار کی روشنی میں بات کر رہی ہوں۔ اگر ہم ایجوکیشن کی بات کرتے ہیں تو 28 پرسنٹ فی میل ریکروٹمنٹ ہے جبکہ 72 پرسنٹ میل۔ اگر ہم پالیٹکس کی بات کرتے ہیں تو صرف 15 پرسنٹ آپ کی فی میل ہیں جو اہم عہدوں پر موجود ہیں باقی سب میل ہیں۔ اگر بچیوں کے اسقاط حمل کے حوالے سے پاکستان کی بات کریں تو پاکستان کا شمار ان دس ممالک میں ہے جن میں فی میل اسقاط حمل کا تناسب سب سے زیادہ ہے۔ اگر ہم وراثت کی بات کرتے ہیں جس کے اوپر بہت زیادہ قرآن نے زور دیا ہے تو اس میں صرف یہ نہیں کہ جو لاعلم ہیں، جاہل ہیں یا پڑھے لکھے نہیں ہیں بلکہ ہماری پڑھی لکھی فیملیز میں بھی اگر فی میل کی وراثت پر بات کی جاتی ہے یا وہ خود اس حق کے لیے آواز اٹھاتی ہے تو سوشل بائیکاٹ ہو جاتا ہے۔ نہیں دیا جاتا۔ آپ کے اپنے اس سیٹ اپ کے اندر بھی۔ تو اگر ان سارے سٹیٹسٹکس (اعداد و شمار) کو ہم سامنے رکھتے ہیں تو مجھے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس سب کی جو بنیاد ہے وہ پاور ریلیشن ہے کیونکہ ایک پاور ریلیشن میں جو قوت و اختیار کا مالک ہو گا وہ اسے کبھی نہیں چھوڑے گا بلکہ اپنے قبضے میں رکھے گا۔ تو اس کا مطلب ہے کہ وقت بدلتا جائے گا، زمانہ بدلتا جائے گا لیکن جو پرابلمز ہیں خواتین کی وہ ویسی کی ویسی ہی رہیں گی۔ ہم اس پہ بہت ڈیبیٹ کریں گے، ہم اس پہ بہت بات کریں گے، ہم اس پہ نئے نئے قوانین بنا دیں گے۔ دیکھیں جب پہلے سے آپ کا مذہب ہی بہت خوبصورت طریقے سے ایک ایک چیز کو کھول کھول کر وضاحت

کے ساتھ بیان کر رہا ہے تو پھر اس کی مزید وضاحت کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے ؟ مجھے جو سمجھ آرہا ہے، یہ طاقت واختیار کا کھیل ہے۔اس کا حل کیا ہے ؟ کیا جو پاور میں ہے وہ اپنی پاور کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوگا؟ کبھی نہیں۔اگر ہوگا تو کیسے ؟

مولانا زاہد الراشدی

بہت اچھی بات کی آپ نے۔گذارش یہ ہے کہ اگر تو ہم تبدیلیاں قوانین کے ذریعے کریں گے تو پاور ہی بنیاد ہو گی۔اس کے لیے ضرورت ہے معاشرتی اصلاح کی۔قانون سے ہٹ کر ۔پاور اور بیلینس سے ہٹ کر ۔معاشرتی اصلاح کی ضرورت ہے۔دانشوروں اوراہل اصلاح کو مذہب کی صحیح تفہیم کے لیے،مذہب اور کلچر کے فرق کے لیے اور حقوق کے شعور کے لیے مکالمہ کرنا ہوگا۔جب تک ایک معاشرتی اصلاح کی تحریک خالصۃً غیر سیاسی بنیاد پر نہیں ہوگی عملی تبدیلی نہیں آئے گی۔جو تبدیلی قانون کے ذریعے ہوگی،سیاست کے ذریعے ہوگی وہ تو پاور کی بنیاد پہ ہی ہوگی۔جس کے پاس پاور ہوگی اس کی بات چلے گی،جس کے پاس پاور نہیں ہوگی اس کی بات نہیں چلے گی۔میں آپ کی بات کی تائید کرتا ہوں۔لیکن اس کے لیے ہمیں معاشرتی اصلاح کی غیر سیاسی بنیادوں پر۔علمی بنیادوں پہ ،فکری بنیادوں پر اور دینی بنیادوں پر معاشرتی اصلاح کی تحریک کی ضرورت ہے۔اللہ کرے کہ ہم میں سے کوئی آگے نکل کر اس سلسلے کو شروع کردے۔

ڈاکٹر فریال عنبرین

بہت شکر گذار ہوں۔ بہت مفید گفتگو رہی۔ دراصل میں اپنی بہن کی بات کے حوالے سے کچھ کہنا چاہتی ہوں، ویل بیلنسنگ کے حوالے سے جو بات ہوئی میری سمجھ میں یہ آتا ہے اور میں اپنے آپ کو ایک طالب علم سمجھتی ہوں کہ مرد اور عورت کے درمیان جو ویل بیلنسنگ ہے وہ کس بنیاد پر ہو گی؟ خواہشات کی بنیاد پر ہو گی یا کسی اور بنیاد پر؟ تو مجھے اس کی سمجھ یہ آتی ہے کہ اس کی بنیاد تقوی ہو گی تو وہ بہت صحیح ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالی نے سورۃ نساء کی پہلی آیت میں ہی ہمیں بتادیا کہ تقوی اختیار کرو۔ اور قرآن میں بھی بار بار یہ فرمایا کہ تقوی اختیار کرو۔ اور بنیادی چیز تو یہ ہی ہے کہ بیلنسنگ خراب اس لیے ہو رہی ہے کہ مرد ہو یا عورت وہ درمیان میں اللہ تعالی کو نہیں رکھتے۔ اور جب درمیان میں اللہ کو نہیں رکھیں گے تو چاہے مرد ہو یا عورت جب اس کے پاس زیادہ طاقت اور اختیار آئے گا تو وہ اس کا غلط استعمال کرے گا۔ باقی مذہب اور کلچر کا آپس میں خلط ملط ہونا یہ مجھے بھی بہت پریشان کرتا ہے۔ لیکن اس حوالے سے مجھے آپ سے یہ سوال کرنا تھا کہ ان کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہماری رہنمائی کون کرے گا؟ اور اس کے لیے ہم کس کی طرف رجوع کریں گے؟

مولانا زاہد الراشدی

آپ نے جو بات فرمائی ہے اس حوالے میں پہلے یہ عرض کر چکا ہوں کہ رہنمائی کے لیے مشترکہ مکالمہ اور مکالمے کے ذریعے رہنمائی۔ ہم اس پر نہیں آرہے۔ ہم میں سے ہر

مکتب فکر، ہر طبقہ اپنی اپنی سوچ کو مسلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مسلط کا لفظ میں نے کہہ دیا لیکن بہر حال جو بھی ہے۔ ہم جب تک مکالمے پر نہیں آئیں گے، عمومی اصلاح کی تحریک پہ نہیں آئیں گے۔ اور وہ بات جو آپ نے فرمائی ہے "تقوی"۔ بالکل، مسائل کے حل کی بنیاد تقوی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک اضافہ اور فرمالیجیے۔ ہماری سماجی ضروریات کیا ہیں؟ اللہ کا خوف اور سماجی ضروریات۔ ہمارے مسائل کیا ہیں؟ طبقات کی خواہشات نہیں۔ سماج کے مسائل کیا ہیں؟ ضروریات کیا ہیں؟ ان کو اگر اللہ کے تقوی اور خوف کی بنیاد پر ہم حل کریں گے تو راستہ نکل آئے گا۔ خدا کرے کہ ہم میں یہ بات آجائے۔

ڈاکٹر ظفر اللہ بیگ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں بے حد شکر گذار ہوں۔ مولانا سے تعارف تو بہت پرانا ہے لیکن سوال وجواب کی نوبت کم آئی ہے۔ آج کی اس نشست میں آپ کی عالمانہ گفتگو سن کر بہت خوشی ہوئی۔ پہلی بات یہ ہے کہ سماجی تاریخ کا جو ارتقاء ہے، ہمیں معاشرہ اس میں دو انتہاؤں پہ نظر آتا ہے۔ جس کا ذکر آپ نے اشارۃً فرمایا کہ ایک انتہاء تو یہ ہے کہ اس میں عورت کو ہر طرح کے جبر کا شکار کیا گیا اور ہر حق سے محروم کیا گیا۔ اب آزادی کے نام پہ ایک دوسری انتہاء یہ ہے جو ہر طرح کے حقوق کے مطالبے کی آڑ میں ہم ہر روز مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس طرح کی آج صورت حال ہوگئی ہے کہ اس میں مرد عورت کی ذمہ داریاں سنبھال رہا ہے اور عورت مرد کی ذمہ داریاں سنبھالتی چلی جارہی ہے۔ اگر شرعی

حدود اور قوانین وضوابط کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بیلنس قائم تو بالکل ہو سکتا ہے۔ جیسے سیرت میں امہات المؤمنین کا کردار اور ان کا جو باوقار رویہ حضور کی ذات کے ساتھ تھا اور حضور کا جو ان کے ساتھ تھا۔ اگر وہ قائم کیا جائے تو یہ معاشرہ بیلنس ہو جائے گا۔ لیکن آج کی مادر پدر آزادی کا جو تصور ہے ۔اقبال کو جب ہم پڑھتے ہیں تو اس میں ہمیں جو چیزیں ملتی ہیں۔ حقوق بین الزوجین ہیں۔ ہمارا معاشرتی نظام ہے۔ ہمارا سوشل سٹرکچر ہے۔ ہمارا ایک تمدنی نظام ہے۔ لیکن آزادی کے حوالے سے مغرب سے متاثر ہو کر اسلامی معاشرہ جس طرح ایک خلفشار کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ اس پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ عورت کے حقوق، مرد کے حقوق۔ ان دونوں کے فرائض، دونوں کا تعین ہونا چاہیے۔ تاکہ یہ معاشرہ بکھرنے سے بچ جائے۔ اور آزادی کے نام پر جو کچھ ہم دیکھتے ہیں، جلسے جلوس وغیرہ جیسے اقبال نے کہا کہ :

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری
تُو اے مولائے یثربؐ! آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زُنّاری

اسی طرح فرمایا:

اُس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد

گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادیِ افکار ہے اِبلیس کی ایجاد

آزادی کی بھی کچھ حدود اور لمیٹیشنز ہونی چاہییں کہ آزادی اسلام نے کس حد تک عورت کو عطا کی ہے؟ کہاں تک رہ کر وہ مرد کی وفادار بن سکتی ہے؟ اور مرد اپنے حقوق کے لیے کیا کرے؟ اب یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ عورت اگر ڈامینیٹ کر رہی ہے مرد کو اور اس کے حقوق میں کوتاہی کر رہی ہے۔ اور مرد عورت بن چکا ہے یا عورت مرد بنتی چلی جا رہی ہے تو ان چیزوں کا تعین بھی ہونا ضروری ہے۔ نہ کہ محض ایک نفسیاتی دباؤ کے تحت آدمی اس طرح کی تحریریں اور تقریریں شروع کر دے۔ یا اس طرح کی گفتگو ہم کریں کہ جس سے ہم خود اپنے ہاتھ سے اس تمدن کی وحدت کو بکھیرنے کا باعث بن جائیں۔ اس کے لیے کام کرنے کی بھی عملاً ضرورت ہے۔ فکر سے کہیں زیادہ اس چیز کی ضرورت ہے۔ میری یہ ہی مختصر سی عرض ہے۔

ڈاکٹر ہدایت خان

بہت شکریہ۔ بہت مفید گفتگو ہوئی۔ یہاں پر ایک چیز ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اسلام جسے ہم کہتے ہیں کہ یہ کمپلیٹ کوڈ آف لائف (مکمل ضابطہء حیات) یعنی زندگی گذارنے کا مکمل طریقہ کار ہے۔ تو اس میں ایک نکتے کو نہیں دیکھنا ہوتا پورے سسٹم کو دیکھنا ہوتا ہے۔ اگر ہم صرف ایک نکتے کو دیکھیں گے، جیسے گاڑی میں صرف پہیے کو دیکھیں گے، اس کا سٹیرنگ نہ ہو انجن نہ ہو۔ ہم ویل بیلنسنگ کی بات کر رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہمیں دوسری چیزوں کو بھی دیکھنا ہے۔ دوسری بات یہ کہ حق اور ذمہ

داری میں ہم فرق نہیں کرتے۔ حق الگ چیز ہے ذمہ داری الگ چیز ہے۔اس لیے جو حقوق دیے گئے ہیں وہ ذمہ داری کی بنیاد پر دیے گئے ہیں۔ میراث کا جو حق مرد کو ڈبل ہے عورت کے مقابلے میں وہ اس لیے کہ اس پہ ذمہ داری زیادہ ہے ۔ہم مغربی معاشرے کو نہ دیکھیں۔اسلام میں عورت کا نفقہ ، سکنی اور اولاد کا نفقہ وہ مرد پر ہے عورت پہ نہیں ہے۔اس لیے عورت کو آدھا حصہ دیا اور وہ بھی بچت ہے۔ مرد کا تو لگ رہا ہے۔اسی طرح گواہی جو ہے یہ ذمہ داری ہے۔تو ہم یہ بات کر کے کہ عورت کی گواہی مرد کے برابر ہو عورت پہ ظلم کر رہے ہیں، آپ عورت پہ ذمہ داری بڑھا رہے ہیں۔اسی طرح عمل کی بات ہے۔ عمل مرد کو ڈبل دیا گیا ہے وہ باہر جائے اور کمائے اور عورت کو شہزادی کی طرح گھر میں رکھے، پردے میں رکھے۔تا کہ اس پر ذمہ داریاں کم ہوں ،اس لیے کہ بچے بھی اس نے پیدا کرنے ہیں، سنبھالنے بھی ہیں۔ ہم مرد تھوڑا سا تصور کریں کہ بچہ پوری رات اگر جگائے ،اس کو دودھ پلائیں اور وہ بیمار ہو تو دن کو ہم کام کے لیے جا سکیں گے ؟اس لیے معاشرے کے سارے پہلوؤں کو دیکھ کر ہم نے کوئی فیصلہ کرنا ہے اور حقوق اور ذمہ داریوں میں فرق کرنا ہے۔اس لیے کہ جتنی کسی کی ذمہ داری ہو گی اتنا اس کا حق بڑھ جاتا ہے۔ذمہ داری کم ہو گی تو اس کا حق بھی کم ہو گا۔ ہم عام طور پہ حقوق اور ذمہ داری کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔یہ فقہی حوالے سے ہے۔ باقی کلچر کے حوالے سے اور معاشرتی سٹیٹس وغیرہ کے حوالے بات ہو سکتی ہے کہ وہ ایک جگہ الگ اور دوسری جگہ الگ ہو سکتا ہے۔ لیکن شرعی لحاظ سے بات کو اس طرح تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر سمجھنا چاہیے۔

پروفیسر ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمن

ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کے تسلسل میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ خورشید صاحب نے ایک بڑی اچھی بات کہی ہے۔ ساری باتیں ہی اچھی کرتے ہیں۔ کہ یہ جو سماج ہے یا میرا اور آپ کا جو تہذیبی ارتقاء ہے یہ ہمارا کوئی انتخاب نہیں ہے، یہ تاریخ کا ایک جبر ہے جو چلتا ہے۔ آج کی اس نشست کا جو بنیادی مقصود اور غرض وغایت ہے وہ یہ تھی کہ اب عورت ملازمت کرتی ہے۔ عورت بازار میں جاتی ہے۔ عورت یونیورسٹی میں جاتی ہے۔ عورت ہاسٹل میں رہتی ہے۔ یہ وہ سارے حقائق ہیں جن سے میں اور آپ چاہیں بھی تو صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اب ان تمام معاملات کے ہوتے ہوئے ہم نے سیرت طیبہ کی روشنی میں کس طرح زندگی گزارنی ہے؟ اور اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو کیا راہ دکھانی ہے؟ ٹھیک ہے جو لفظ استعمال کیا خورشید صاحب نے کہ تاریخی جبر کے ساتھ رہتے ہوئے آپ دین کی راہ پر کس طرح قائم رہ سکتے ہیں؟ کل خدا کے سامنے کس طرح سرخرو ہو سکتی ہیں؟ اب آپ نے درست فرمایا جو گواہی والی بات ہے، میں علامہ صاحب سے ایک گذارش کرنا چاہتا تھا کہ مثال کے طور پر میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ہماری بچیوں کے ہاسٹلز۔ اور وہاں پہ کوئی مجرمانہ واردات ہوتی ہے اور کوئی میل موجود نہیں ہے گواہی دینے کے لیے، تو کیا وہ مجرم اسی طرح دندناتا پھرتا رہے گا؟ آپ تو کہیں گے کہ اس میں عورت کی گواہی ہی قبول نہیں ہے۔ تو کیا صورت حال پیش آئے گی؟ جو آپ کی سیاست ہے، اس میں عورت داخل ہو چکی ہے، صرف مخصوص سیٹوں پہ نہیں وہ باقاعدہ انتخابی عمل سے گذرتی ہے۔ اب اس انتخابی عمل سے گذرنے کے لیے آپ

نے اس کے لیے کوئی راہ متعین کرنی ہے۔ بہر حال میں اس کو مختصر کرتا ہوں۔ میں بے حد شکر گذار ہوں آپ کا لیکن ایک گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ کہ یہ جو آج کی مجلس ہے اس میں آپ یہ تنوع دیکھیں گے، جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے۔ کہ الحمد للہ تمام مکاتب فکر کے لوگ اور مختلف ذہن رکھنے والے لوگ، طبقات سے بھی آزاد، وہ سارے موجود ہیں۔ اور میرے خیال میں جس مکالمے کی طرف آپ اشارہ فرمار ہے ہیں، یہ اس کی ایک خوبصورت ابتداء ہے۔ ہم ان شاء اللہ اس کو آگے بڑھائیں گے۔ لیکن میری آپ کی وساطت سے، کیونکہ آپ طبقہ علماء کے ایک انتہائی معتبر نمائندہ ہیں۔ جس پہ مختلف مسالک کے لوگ بڑی خوش دلی کے ساتھ اعتماد کرتے ہیں۔ کہ اب میرے خیال میں علماء کو اور ہمارے مفتیان کو اور منبر و محراب کے لوگوں کو لگی لپٹی کے بغیر جن چیزوں کی طرف آپ نے اصولی طور پر اسلام کا موقف بیان فرمایا ہے، اسے کھل کر بیان کرنا چاہیے۔ اور اس کو منبر سے، محراب سے۔ درس سے تدریس سے، اور اپنے فتوے کے ذریعے سے منظر عام پر لانا چاہیے۔ میں اس کنفیوژن کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس کا میں نے ابتداء ذکر کیا تھا کہ کنفیوز ہیں لوگ۔ جو بچیاں، اب میری بعض بیٹیوں نے چہرے کا پردہ کیا ہوا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ یہی اسلامی پردہ ہے۔ بعض ہماری بیٹیاں ہیں وہ چادر اوڑھتی ہیں، وہ کہتی ہیں یہی پردہ ہے۔ بعض چہرہ کھلا رکھتی ہیں وہ کہتی ہیں یہی اسلامی پردہ ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ اور وہ ایک دوسرے سے کہیں یا نہ کہیں لیکن ذہنی تصادم ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ ہر ایک اپنے آپ کو درست سمجھتی ہے۔ اس کنفیوژن سے نکالنے کی ذمہ داری میرے خیال میں آج منبر و محراب اور فتوی کی مسانید پر رونق افروز ہمارے مفتیان دین متین کی ہے۔ میری یہ خواہش ہو گی اور یقینا

آپ سب کی بھی یہ خواہش ہو گی کہ جس طرح آج مولانا زاہد الراشدی صاحب نے ہماری درخواست کو قبول فرمایا،اس مجلس کو رونق بخشی اور ہمیں مستفید فرمایا ہے۔ایک نشست ہمیں اور یہ دیدیں اپنی مرضی کے مطابق جس میں یہ جو آج سوالات پیدا ہوئے ہیں ان پہ دوٹوک اپنی رائے دیں کہ میرا نکتہ نظر یہ ہے۔تاکہ ہم پاکستان کے ایک معتبر عالم دین کی رائے کو منظر عام پر لانے میں کامیاب ہو سکیں۔اور سیرۃ چیئر کی ایک خواہش یہ بھی ہے کہ اس مجلس میں مثال کے طور پر آج آپ کی اس مجلس کا انعقاد ہوا ہے۔جو گفتگو ہوئی ہے ہم اس کو ضبط تحریر میں لائیں۔اور پھر اس کو منظر عام پر بھی لائیں۔تھوڑی بہت تو ایڈیٹر کو اجازت ہوتی ہے ،ہم کچھ تھوڑا بہت تو اپنا حق استعمال کر سکتے ہیں۔وہ تو ہم کریں گے لیکن جو اصولی باتیں ہیں ان شاءاللہ ان کو ہم من و عن اہل علم کی خدمت میں پیش کریں گے۔اس پر مکالمے کا اغاز کریں گے۔یہ کوئی حتمی رائے نہیں ہے۔مولانا بھی اپنی رائے دیں گے۔وہ کوئی حتمی رائے تو نہیں ہے،وہ ان کی رائے ہے۔اہل علم اس پہ گفتگو کریں گے، ممکن ہے نتیجہ کوئی اور نکل آئے۔

ڈاکٹر ثناءاللہ حسین

ایک اہم مسئلہ ہے۔جب ہم تاریخ کو دیکھتے ہیں تو ہر دور میں وہاں خواتین کے لیے اسلامی مملکتوں میں مفتیات موجود رہیں۔آپ اندلس کو دیکھ لیں،قرطبہ کو دیکھ لیں،امام مالک رحمہ اللہ کی بیٹی کو دیکھ لیں۔مدینہ میں دیکھ لیں،مکہ میں دیکھ لیں۔لیکن آج پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام میں یہ کمی ہے کہ صرف اور صرف مرد مفتی حضرات موجود ہیں خواتین مفتیات موجود نہیں ہیں۔اس لیے کہ بہت سے ایسے مسائل ہوتے ہیں جو

خواتین خود جا کر مفتی صاحب سے پوچھنے میں شرم محسوس کرتی ہیں۔اس لیے اگر وفاق المدارس، تنظیم المدارس وغیرہ ان مدارس وغیرہ کو کہدیں کہ آپ مفتیات کے لیے بھی کوئی کورس ترتیب دیدیں تاکہ خواتین اپنے ان مسائل کے لیے جو وہ مرد حضرات سے پوچھنے میں مشکل محسوس کرتی ہیں ان کی طرف رجوع کر سکیں۔تو یہ ایک بہت مفید اقدام ہوگا۔

مولانا زاہد الراشدی

دو باتیں ہیں۔ایک بات آپ نے فرمائی مفتیات کی۔تو میں آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ ہمارا مجلس مفتیان کرام کا ایک آن لائن کورس ہے۔جس میں مفتیات کے پہلے بیچ کا کورس ہم نے مکمل کروادیا ہے اور دوسرے کے لیے داخلے جاری ہیں۔تو آغاز ہم نے کر دیا ہے۔اور دوسری بات میں نے عمداً آج مسائل پہ بات نہیں کی ۔کیونکہ یہ موقع نہیں تھا، مسئلے پہ بات لمبی ہوتی ہے۔مسائل پہ جب آپ بات کریں گے، کسی بھی مسئلے پر، ان شاءاللہ حاضری بھی دوں گا، بات بھی کروں گا اور مکالمے میں بھی حصہ لوں گا ان شاءاللہ۔

پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز (صدارتی کلمات)

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم۔امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔بسم اللہ الرحمن الرحیم۔میں سمجھتا ہوں کہ میرے لیے تو یقیناً ایک بہت بڑا اعزاز ہے کہ اتنی بڑی علمی محفل کی صدارت کا اعزاز ہمارے بہت ہی اچھے دوست اور رفیق کار، سیرت

چیئر کے مسند نشین جناب ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمان صاحب نے مجھے دیا۔اور یہ چند گھنٹے علمی طور پر بے انتہا ثمر آور رہے۔ خواتین کے حوالے سے بہت علمی، بہت اہم نکات، بہت سے حوالے، مسائل، مسائل کا ممکنہ حل، صورت حال۔ ہمارے ماہرین کے خطابات سے سامنے آئے۔ حضرت مولانا علامہ زاہد الراشدی صاحب نے، جناب خورشید ندیم صاحب نے، جناب عرفان شہزاد صاحب نے، محترمہ ہماری بیٹی نے اور جس طریقے سے باقی ہمارے اساتذہ کرام ہیں، محققین ہیں انہوں نے سوالات اٹھائے۔تو بہت سارے گوشے اور نئے گوشے وا ہوئے۔ مرد اور خاتون کی ویل بیلنسنگ کا مسئلہ جو ہے، یہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا انسان، خود انسان کی عمر کے ساتھ، حضرت حوا علیہا السلام کی پیدائش کے ساتھ ہی یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔اور پھر تورات میں آپ دیکھیں کہ کس طریقے سے تورات نے اس موضوع کو ٹیکل کیا؟اور پھر اس سے کس قسم کے سوالات آئے؟حضرت حوا کیسے پیدا ہوئیں؟اور پھر اس پیدائش کے نتیجے میں کیا تصورات پیدا ہوئے؟ پھر قرآن پاک نے اس کے لیے کیا الفاظ استعمال کیے؟تو یہ مسئلہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان ہے۔اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اختتام کائنات نہیں ہو جاتا۔انسان کا خاتمہ نہ ہو۔یہ مسئلہ کسی نہ کسی صورت میں، کسی نہ کسی حوالے سے، کسی نہ کسی نوعیت کے لحاظ سے، کسی نہ کسی ملک میں اپنے عرف اور اپنے حالات کے مطابق یہ یقیناً جاری رہے گا۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ختم ہونے والا نہیں ہے۔اور اس میں بہتری لانے کے لیے، اس کی بہتر تفہیم کے لیے، مکالمے کی جو اس وقت تجویز آئی، میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہترین تجویز ممکن نہیں ہے۔یہ مکالمہ جو ہے ہمیں جاری رکھنا چاہیے۔اور اس کے لیے سیرت چیئر

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل یہ ایسے پلیٹ فارمز ہیں کہ وہ اس قسم کے مسائل اور اس قسم کی صورت حال کو مکالمے کا رنگ دینے کی پوزیشن میں ہیں۔ابھی ہمارے پاس ایجنڈے میں سولہ سترہ مئی کو جو ہمارا اجلاس ہوا اس میں اسلام آبادہائی کورٹ کے دوججز کے فیصلے تھے۔جسٹس بابر ستاراور جسٹس عامر فاروق۔اور اس میں ہم نے رائے یہ دی کہ کم سنی کی شادی قانونی طور پہ تو غیر قانونی ہے۔پاکستان کا جو قانون ہے۔ قانونی طور پر 1961 فیملی لاز آرڈیننس کے مطابق وہ غیر قانونی ہے۔اور اب ہماری عدالتیں جو ہیں چونکہ وہ اس قانون کی پابند ہیں تو انہوں نے تو اسی قانون کے مطابق فیصلہ دینا ہے۔ لیکن پھر اسی قانون کے اندر یہ بھی گنجائش ہے کہ یہ شادی جو ہے اس کو آپ باطل نہ کریں۔ جرمانہ بے شک لگائیں۔ان دونوں فیصلوں میں اس کو باطل قرار دیدیا گیا۔تو ہم نے پھر یہ سوال اٹھایا کہ ایک تو یہ خود پاکستانی قانون کی خلاف ورزی ہے،دوم جب آپ اس کو زنا بالجبر قرار دے رہے ہیں تو اس کے بعد جو ہونے والی اولاد ہے اس کا نسب جو ہے اس کو بھی آپ مخدوش بنار ہے ہیں۔اور پھر جو معاشرتی مسائل پیدا ہوں گے ، ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے بھی ایک گفتگو کی ،ایک سوچ کی اور ایک راستہ نکالنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے کوئی اس فیصلے کی مذمت نہیں کی،ہم نے کچھ سوالات اٹھائے اور وہ ہم نے پیش کیے۔یہ جو مسئلہ ہے اس وقت ، پورے ملک اور ایک پورے معاشرے کا مسئلہ ہے۔ صرف پاکستان کا نہیں ۔ابھی ہم افغانستان گئے تھے۔ 21 سے 24 جولائی تک ہم وہیں تھے۔او آئی سی کے وفد کے حوالے سے۔اور وہاں بھی او آئی سی کے وفد کے صرف دو موضوعات تھے۔ایک موضوع تھا "رائٹ آف ایجوکیشن" یعنی تعلیم کا حق خواتین کے لیے۔اینڈ "رائٹ ٹو

ورک" خواتین کے لیے اس بات کا حق کہ وہ کام کریں ۔اور سوائے ان کے بڑے امیر المؤمنین اور قائد کہ جن سے ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ باقی جتنے بھی وہاں کے بڑے بڑے ذمہ دار عہدیدار تھے ان سے ہماری ملاقات ہوئی۔ کسی نے بھی اس موقف کو جس موقف کو آج حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب نے تفصیل سے پیش کیا۔اور جس طریقے سے نکات جناب خورشید ندیم صاحب کی طرف سے سامنے آئے۔ان کا امتزاج ہمارے وفد کے قائد جناب پروفیسر قطب مصطفی سانو جو کہ او آئی سی کے مجمع الفقہ الاسلامی کے امین العام ہیں، سیکرٹری جنرل ہیں۔اور بہت بڑے عالم ہیں۔ میں نے انہیں چند دنوں میں جتنا سنا، میں سمجھتا ہوں کہ عالم اسلام کی ایک بہت بڑی علمی شخصیت ہیں۔ گینی سے ان کا تعلق ہے لیکن عربی پر، انگریزی پر، فرنچ پر اور دیگر مختلف زبانوں پر انہیں عبور حاصل ہے۔اور اصول فقہ پہ جو ان کو کمانڈ ہے اسی طرح قرآن اور حدیث پر وہ بہت اعلی درجے کی ہے۔ تو یہ تمام باتیں جو ابھی اس مجلس میں کی گئی ہیں افغان قائدین کے سامنے پیش کی گئیں۔ کسی نے انکار نہیں کیا۔اور انہوں نے صرف ایک بات کی ۔اور وہ بات یہ تھی کہ ہم نے تعطل کا اعلان کیا ہے تاامر ثانی چھٹی جماعت سے بارھویں جماعت تک۔ چھٹی جماعت سے پہلے بھی تعلیم ہے۔اور بارھویں جماعت سے اوپر بھی ہم نے اجازت دی ہے۔ تو یہ جو تعطل کی کیفیت ہے اس کے لیے ہم سوچ رہے ہیں ۔انہوں نے صرف ایک لفظ کا بار بار اعادہ کیا کہ ہم یقینی بنانا چاہتے ہیں اس دور میں عورت کی عفت کے مسئلے کو۔ کہ عورت کی عفت کو ہم یقینی بنانے کی پوزیشن میں ہوں۔ ہم نے ان کے ساتھ بہت ہی ملفوف انداز میں، بہت ہی پارلیمانی اور سفارتی انداز میں اختلاف کیا۔اور ہم نے کہا کہ امارت اسلامیہ اگر ایک بار اعلان کرے تو ہمیں یقین

ہے کہ پورے ملک میں کسی کو جرأت نہیں ہوگی کہ وہ کسی عورت کی اہانت کرے یا عورت پر دست درازی کرے۔ تو یہ آپ کے لیے ان کی تعلیم اور ان کی عفت دونوں کو یکجا کرنا اور برقرار رکھنا یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اچھا عرف جو ہم نے کابل میں دیکھا، پہلے بھی دیکھا تھا لیکن اس بار جو دیکھا وہ یہ تھا کہ اب کابل میں جو کابل کو جانتے ہیں ،افغانستان کو جانتے ہیں انہیں معلوم ہوگا کہ وہاں کا اپنا ایک کلچر ہے۔ قندھار کا اپنا کلچر ہے۔ سنٹرل افغانستان کا الگ کلچر ہے۔ پکتیکا اور خوست کا الگ کلچر ہے۔ اور یہ تمام علاقے جو ہیں یہ پختون خواہ بیلٹ کے ساتھ متصل ہیں، لگے ہوے ہیں۔ اور ان کے درمیان بے انتہا آپس کا ایک تعامل ہے۔ چنانچہ ہم نے برقع بھی دیکھا، جو قندھار کا برقع ہے وہ بھی دیکھا۔ مکمل شٹل کاک۔ لیکن ہم نے افغانستان کے اندر بے انتہاء عورتوں کو بازاروں میں گھومتے پھرتے دیکھا۔ اور خوبصورت ان کے کپڑے لیکن منہ یعنی چہرہ ان کو رڈ اور کھلا ہوا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ افغانستان کا عرف ہے صرف کابل کا عرف نہیں۔ اور بھی علاقوں کا یہ عرف ہے۔ کہ مکمل باڈی کور ہے لیکن فیس حنفی فقہ کے عین مطابق کھلا ہے۔ تو اگر عرف کو وہ تسلیم کرلیں اور عرف کو وہ بڑھاوا دیں، عرف کا تحفظ کریں تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہاں بھی یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ جتنے مختلف اسلامی معاشروں کو ہم نے دیکھا ہے یا مطالعہ کیا ہے تو اس وقت میری جو تفہیم ہے اس میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ ملائشیا کے اندر اس مسئلے کو اطلاقاً بھی حل کیا گیا ہے، جو آئیڈیل پوزیشن ہے وہ تو یہ ہے جو حضرت علامہ زاہد الراشدی صاحب نے بیان فرمائی۔ اطلاقی پوزیشن کے اندر مسائل ہیں جو خورشید ندیم صاحب نے بتائے۔ لیکن آئیڈیل اور اطلاق کو اگر کسی نے ایک خوبصورت رنگ دینے کی بڑی کامیاب کوشش کی، میں سو فیصد کامیاب

نہیں کہوں گا لیکن بڑی حد تک کامیاب کوشش، وہ ملائشیا کی سوسائٹی ہے۔ جہاں پر مذہب، روایت اور جدت تینوں کا امتزاج جو ہے۔ آپ کو وہاں کی خواتین کے اندر یہ امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مکالمے کی اس روایت کو برقرار رکھا جائے۔ کوئی اور موقع ایسا بھی آجائے کہ ہمیں ملائشیا کا کوئی ماہر، ملائشیا کا کوئی سکالر ملے اور ہم ان سے یہ دریافت کریں کہ کس طریقے سے ملائشین صورت حال میں اس امتزاج کو جو کہ یقیناً ایک تاریخی جبر ہے اور ہم اس سے نکل نہیں سکتے، اس تاریخی جبر کو کس طریقے سے ایک خوبصورت رنگ دیدیا جائے۔ جو ملائشیا کی معاشرت میں ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ ایک آخری نکتہ جس کے ساتھ میں اپنی معروضات کا اختتام کرتا ہوں کہ ایک اور مشکل صورت حال ہمارے ملک میں اب آنے والی ہے۔ اور وہ مشکل صورت حال جو ہے وہ نیو لبرل پالیسیز ہیں جو ہماری ایجوکیشن کے اندر بھی آگئی ہیں، ہم کہتے ہیں کہ عورتوں کو تعلیم کے بڑے مواقع مل گئے ہیں۔ اور یونیورسٹیوں میں اب عورتوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں باپردہ بھی، ایسی بھی جو شاید ہمارے لیے اور ہمارے جیسے بہت سے لوگوں کے لیے وہ انداز لباس کا شاید پسندیدہ نہ ہو ۔ لیکن اس کے اندر ایک بہت بڑی تبدیلی آئی ہے۔ اور اس میں یہ فرق بھی پیش نظر رہے کہ یہ پورا فینامنا جو ہے یہ اربن ہے رورل نہیں۔ دیہاتی علاقوں کے اندر جو پسماندگی ہے وہ مزید بڑھ رہی ہے۔ حکومت نے تعلیم سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ چنانچہ خواتین کے اسکولز اور خواتین کے کالجز اب دیہاتی علاقوں میں، دور دراز کے علاقوں میں نہیں بن پا رہے۔ بلکہ اس سیکٹر کو بھی اب پرائیویٹ انٹرپرائز جو ہے وہ جگہ دے رہا ہے۔ اور پرائیویٹ انٹرپرائزر میں صرف ان لوگوں کے لیے مواقع ہوں گے جنکی

جیب بھاری ہے۔ جن کے پاس پیسے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ڈیوژن جو ہے یہ آنے والے سالوں میں مزید بڑھنے والی ہے۔اس کے لیے بھی ہم نے یقیناً کسی ماہر تعلیم کو اور کسی ماہر معاشرت کو یا دو لوگوں کے پینل کو بٹھانا ہوگا کہ یہ جو منصوبے منہج تعلیم کے ہیں 2003 سے لے کر اب تک جو جاری ہیں،اس کے جو اثرات ہماری خواتین کے اوپر، ہماری معاشرت کے اوپر اور ہماری عائلی صورت حال کے اوپر مرتب ہو رہے ہیں اور جو نتائج ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ دعاء زہرا کا کیس ہے، نمرہ کاظمی کا کیس ہے۔ یہ واحد کیسز نہیں ہیں۔ یہ تو ہمارے میڈیا میں آنے والے کیسز ہیں۔ آپ فیملی کورٹس میں جائیں، تو اس قسم کے کیسز روزانہ ایک بہت بڑی تعداد میں آپ کو دیکھنے کو ملیں گے۔ کہ کیوں خواتین، بچیاں جو ہیں وہ گھروں سے باہر اس طرح نکل رہی ہیں اور بغیر عائلی سسٹم کے۔ تو یہ سارے مسائل ہیں کہ جو سیرت چیئر کے سامنے اور اسلامی نظریاتی کونسل کے سامنے ہیں۔ ان شاء اللہ ہم مل کر مکالمے کے ذریعے انہیں حل کرنے کی کوشش کریں گے۔



